12 12

داستان

داستانِ اردو

نصیر حسین خیال

ادارۂ اشاعت اردو
حیدرآباد دکن

It is a good book on
urdu Adab, but tasteless
It is better to read it
than to read not at all,
any Book on Adab.

M. Shafi Ranjith
Mirza Randth

26/9/1961

داستانِ اردو

از

ادیب الملک نواب نصیر حسین خاں خیاؔل

اِدارۂ اشاعتِ اردو
حیدرآباد (دکن)

پیش لفظ

خاندانی حالات

ادیب الملک نواب نصیر حسین خاں خیال ہماری زبان کے وہ بے مثل صاحب طرز ادیب ہیں جس پر خود اردو زبان کو ناز ہے۔ نواب خیال خاندانی رئیس تھے آپ کے مورث اعلیٰ عرب سے ایران آئے اور وہاں بڑا رسوخ حاصل کیا اور رفتہ رفتہ اقتدار اتنا بڑھا کہ اراکین خاندان اعلیٰ مراتب پر پہنچے۔ اس کے بعد اس خاندان نے ہندستان جنت نشان کا رخ کیا۔ یہاں بھی قسمت ساتھ آئی اور عظمت و وجاہت ہم رکاب رہی۔ اس وقت ہندستان پر مغل حکمران تھے، اس خاندان کی خوب عزت ہوئی کئی افراد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے اور بے مثل ترقی کی۔ اسی خاندان کے دو بھائی قطب الملک نواب سید عبداللہ خاں اور امیر الامرا نواب سید حسین علیخاں "بادشاہ گر" کہلائے۔ ایک عرصہ تک سلطنت کے نظم و نسق میں یہی دونوں بھائی دخیل رہے اور انہی کے مشوروں سے ملک کے کاروبار چلتے رہے۔

امیر الامرا سید حسین علی خاں سب سے پہلے بہار کے صوبہ دار مقرر ہوئے ان کا مستقر عظیم آباد تھا۔ اس صوبہ میں ان کو بادشاہ دہلی کی طرف سے جاگیر عطا ہوئی تھی۔ اس کے بعد حسین علیخاں وزیر ہوئے تو یہ جاگیر ان کے چھوٹے بھائی نواب زین الدین علی خاں کو ملی اور انھوں نے اس تقریب سے بہار میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ نواب زین الدین علی خاں نواب خیال کے پردادا تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں کچھ ایسے اسباب پیدا ہوگئے تھے جس سے اس خاندان کے زوال کی

امکانات نظر آنے لگے تھے لیکن نواب علی وردی خاں مہابت جنگ صوبہ دار بنگالہ کے تعلقات اور رشتہ داری سے اس خاندان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور اس خاندان کی عظمت برقرار رہی۔

نواب خیال کا خاندان ہمیشہ سے اردو کا سرپرست رہا ہے۔ دلی جب مٹی تو صوبہ بہار باکمالوں اور ہنروروں کا مسکن تھا۔ اس خاندان نے دلی کے باکمالوں کی اچھی قدر کی اور ان کی قدردانی نے عظیم آباد کو دلی بنا کر چھوڑا۔ یہاں اردو کو اس قدر ترقی ہوئی کہ شعر و شاعری کا ایک علیحدہ اسکول قایم ہو گیا۔ نواب ہدایت علی خاں اسد جنگ بہادر اور ان کے فرزند نواب غلام حسین خاں (مصنف سیر المتاخرین) اسی خاندان کے افراد ہیں۔ یہ دونوں حضرات بھی اردو کے بڑے سرپرست اور مربی تھے۔

غرض اسی خاندان میں جو امارت و وجاہت اور علم و فضل کے اعتبار سے ہندستان میں مشہور تھا نواب نصیر حسین خاں خیال ۱۲۹۵ھ میں بمقام عظیم آباد (پٹنہ) پیدا ہوئے! امرا و روسا کی طرح گھر میں تعلیم پائی۔ اردو کا کیا ذکر یہ تو گھر کی لونڈی تھی۔ عربی فارسی میں اچھی استعداد تھی۔ انگریزی بہت اچھی جانتے تھے۔ فرانسیسی سے بھی بقدر ضرورت واقف تھے۔ طبیعت مضمون نگاری کی طرف مائل ہوئی۔ قدرت نے موزوں دل و دماغ عطا کیا تھا چند ہی روز میں چمک گئے۔

نواب خیال کی مضمون نگاری

ابتدا میں رسالہ حسن حیدرآباد میں فرضی نام سے مضمون لکھتے رہے۔ ۱۸۹۶ء میں جب مشہور نثر نگار علی سجاد نے عظیم آباد سے رسالہ ادیب جاری کیا تو آپ اس رسالہ میں مضمون لکھنے لگے۔ آپ کی زباندانی اور ادب کو دیکھ کر سرسید و عبدالحلیم شرر نے بڑی تعریف کی تھی۔ علی سجاد کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ نواب خیال ابھی نو عمر ہی تھے کہ اردو کے بڑے ہوشمند انشا پرداز سمجھے جانے لگے۔

۱۸۹۹ء میں آپ کی شادی کلکتہ میں انتظام الدولہ مرزا احمد بیگ وزیر شاہ اودھ کی دختر سے ہوئی اور اس تعلق سے آپ نے عظیم آباد چھوڑ کر کلکتہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔

کلکتہ آنے کے بعد مضمون نگاری کا شوق بہت بڑھا۔ ملک کے مختلف رسائل میں مضمون لکھنے لگے۔ آپ کے اکثر مضامین ارٹنگ کے نام سے شایع ہوئے ہیں آپ کے مضامین بہت دلچسپی سے پڑھے جانے لگے۔ مدیران رسائل و اخبارات کی طرف سے فرمائشیں شروع ہوئیں۔ غالباً ۱۹۰۰ء میں مولانا ظفر علی خاں کی فرمائش پر "مرثیہ اور مرزا دبیر" کے عنوان سے ایک بہت ہی جامع مضمون لکھا جو دکن ریویو کے کئی نمبروں میں شایع ہوا ہے۔ اس مضمون پر نواب کے تنقیدی مطالعہ اور قوت تحریر کی بڑی ستایش کی گئی آپ کا ایک بہت ہی مشہور مضمون "خالاؤں کا مارا آغا" ہے جو ۱۹۱۳ء میں رسالۂ ادیب الہ آباد کے کئی نمبروں میں شایع ہوا ہے۔ اس مضمون کی اشاعت نے زبان اور طرز نگارش کا پایہ بہت بلند کر دیا۔ اس کے علاوہ نواب خیال نے بہت سے متفرق مضامین لکھے اور لاجواب انشاپردازی کی وجہ سے سارے ملک سے خراج تحسین حاصل کیا۔ جن رسائل میں آپ کے مضامین شایع ہوئے ہیں ان کے چند نام یہ ہیں۔

حسن حیدرآباد۔ ادیب عظیم آباد۔ العصر الہ آباد۔ اولڈ بوائے علیگڈھ علیگڈھ میگزین۔ دکن ریویو حیدرآباد۔ سہیل علیگڈھ۔ نقیب بدایون۔ نوائے کیمبرج۔ جادو ڈھاکہ۔ آفتاب کلکتہ۔ شمس کلکتہ ندیم گیا۔

نواب خیال کے سیاسی مشاغل

آپ کی کوئی مستقل کتاب شایع نہیں ہوئی داستان اردو کے نام سے ایک بسیط کتاب لکھ رہے تھے یا لکھ چکے تھے۔ یہ کتاب بھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی البتہ اس کے بعض اجزاء رسائل میں شایع ہوئے ہیں اس کا ایک حصہ مغل اور اردو کے نام سے

چھپ گیا ہے۔ شاہنامہ فردوسی پر آپ نے ایک طویل تنقیدی مضمون لکھا تھا جو بصورت کتاب شایع ہوا ہے۔ مرثیہ گویوں کا ایک تذکرہ لکھ رہے تھے لیکن موت نے اس کی تکمیل کا موقع نہیں دیا۔ یہ بھی سنا گیا تھا کہ گارسان دتاسی کے فرانسیسی تذکرۂ شعرائے اردو کا ترجمہ کر رہے تھے لیکن یہ بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ۱۹۱۶ء میں آپ جب اردو کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کے صدر منتخب ہوئے اور اس موقع پر آپ نے جو خطبہ سنایا تھا وہ آپ کی ضخیم تصنیف داستان اردو کا مکمل خلاصہ تھا۔ اور وہ یہی مقالہ ہے جو پیش خدمت ہے۔ یہ مقالہ نواب کی ادبی پیداوار میں شہ کار کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ اپنے موضوع کی حد تک مکمل اور ہزاروں صفحات کا نچوڑ ہے۔

علمی و ادبی مشاغل کے ساتھ ساتھ نواب خیال قومی معاملات میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ مسلم لیگ میں شریک رہ کر آپ نے بڑی سرگرمی سے قومی خدمت انجام دی ایک حیثیت سے اگر آپ کو لیگ کے بانیوں میں شمار کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کا ایک وفد مسلمانوں کی حیات سیاسی سے تعلق رکھنے والے مسایل کو سلجھانے اور سمجھانے کے لئے بمقام شملہ لارڈ منٹو کی خدمت میں باریاب ہوا تھا نواب صاحب بھی اس وفد کے خاص رکن تھے اور اس موقع پر مسلمانوں کی پورے جوش و سرگرمی کے ساتھ نمایندگی کی تھی۔ آپ کی کوششوں سے مسلم لیگ کی ایک شاخ غالباً ۱۹۰۸ء میں بنگال میں قایم ہوئی۔ نواب خیال کو سیاسی معاملات کے علاوہ تعلیمی اُمور سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ طلبہ کے بڑے ہمدرد تھے اور ان کی بڑی مدد کیا کرتے تھے۔ نواب خیال نے ڈسمبر ۱۹۳۴ عیسوی میں وفات پائی۔

نواب خیال کی طرز نگارش

اب ہم نواب خیال کے حالات زندگی مختصر طور پر بیان کرنے کے بعد اس مقام پر آگئے ہیں جو نواب کا اصلی مقام ہے اور اسی نے نواب کے نام کو زندہ رکھا ہے اور زندہ رکھے گا اور جب تک اردو زبان دنیا میں موجود ہے نواب کا نام ایک بے مثل ادیب کی حیثیت سے لیا جاتا رہے گا۔

نواب خیال ایک خاص طرز تحریر کے مالک تھے۔ اب تک اس طرز میں لکھنے والا کوئی دوسرا ادیب پیدا نہیں ہوا۔ نواب کی انشا پردازی بہت سی خصوصیات کی حامل ہے۔ سب سے اہم چیز یہ ہے کہ مضمون کے لئے آپ جو موضوع تلاش کرتے ہیں اس موضوع کی فطرت کے عین مطابق الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں اور یہی ترتیب مضمون میں جان پیدا کر دیتی ہے۔ نواب کی تحریر میں یہ بڑی خاص چیز ہے۔ بغیر حسن ترتیب کے آپ کتنے ہی خوبصورت الفاظ اپنے مضمون میں جمع کیجئے نہ اس میں دلکشی پیدا ہوتی ہے نہ گھلاوٹ۔ برخلاف اس کے یہی فطرت شناسی اور احساس توازن نواب خیال کی تحریر میں حسن پیدا کر دیتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نواب خیال جب کسی موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں تو زبان کا استعمال اس کے مطیع ہو کر نہیں بلکہ اس پر قادر و قابض ہو کر کرتے ہیں۔ نواب خیال کی عبارت میں آپ سادگی کے باوجود بلا کا بانکپن اور غضب کی شوخی پائیں گے جس سے پڑھنے والا گرویدہ ہو جاتا ہے اور نواب کا قلم ہے کہ بے تکلف روانی کے ساتھ بیل بوٹے اتارتا چلا جاتا ہے اور قاری پر ایک کیف طاری ہو جاتا ہے اور خاص صفت یہ ہے کہ عبارت کا رنگ کسی جگہ بھی پھیکا

ہونے نہیں پاتا۔

نواب خیال کے مضمون کو پڑھنا شروع کیجئے۔ آپ ہر جگہ فکر و نظر کی جولانیاں دیکھیں گے۔ ہر فقرہ میں الفاظ کی سحر کاریاں اٹکھیلیاں کرتی نظر آئیں گی، وسعت علم، احساس شعریت اور نزاکت خیال کا امتزاج آپ کو اپنا بنا لیگا عبارت چٹکی کھائے گی اور انداز بیان پکار اٹھے گا کہ میرا لکھنے والا فلاں شخص ہے اور یہی نواب خیال کی تحریر کا بڑا کمال ہے۔ ایک مغربی مصنف لکھتا ہے کہ واقعات روزگار کو ہر شخص بیان کر سکتا ہے لیکن ضرورت ایسے شخص کی ہے جو بیان کرنا جانتا ہو۔ نواب خیال اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ آپ کے قلم سے جو تحریر نکلتی ہے حسن بیان کی وجہ سے مقبول خاص و عام ہو جاتی ہے۔

آج بکثرت اہل قلم پیدا ہو گئے ہیں، ہر شخص لطیف نگاری کا دعویدار ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ بہت ہی کم لوگوں نے انشاء پردازی میں جگہ حاصل کی ہے۔ بے راہروی اور مطلق العنانی آج کل کی انشاء پردازی میں بہت نمایاں ہے۔ طرز نگارش میں کوئی اضافہ ہوا ہے نہ اسلوب بیان میں الفاظ کے غلط استعمال اور بے معنی فقرات کا نام لطیف نگاری رکھا گیا ہے۔

داستان اردو کی اشاعت

داستان اردو کے نام سے نواب خیال کا جو مقالہ شائع کیا گیا ہے وہ انشاء پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں زبان اردو کی تاریخ بہت ہی لطیف پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں عبارت کی دلاویزی اور انداز بیان کی سحر کاری کے ساتھ

استعداد و فکر اور تاریخی معلومات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ اور ہند و مسلم تعلقات پر اپنے وسعت علم اور حکیمانہ نظر سے اس قدر اچھے انداز میں نظر ڈالی ہے کہ بے اختیار کلماتِ تحسین نکلتے ہیں۔ یہ بھی وقت کی بڑی ضروری چیز ہے۔

اس سلسلہ میں ہم یہ ظاہر کرنا مناسب خیال کرتے ہیں کہ نواب خیال کے دیگر علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین کا ایک اور مجموعہ بھی زیر ترتیب ہے بہت سے مضامین فراہم ہو چکے ہیں۔ اس بارے میں اَرباب علم و ادب سے اور خصوصاً نواب خیال کے عزیز و اقارب سے گزارش ہے کہ ان کے پاس نواب صاحب کے جس قدر مضامین ہوں وہ از راہ کرم ہمارے پاس بھیجدیں۔ اگر وہ چاہیں تو اِشاعت کتاب کے بعد ہم ان کے مضامین بہ حفاظت تمام شکریہ کے ساتھ واپس بھیجدیں گے۔

(چوہدری) محمد اقبال سلیم گاہندری

داستانِ اردو

بنامِ[1] ایزد بخشایندہ بخشایش گر مہربان دادگر!

عجائبات دنیا[2] میں سے عجیب تر اُس کا وہ حصۂ ارضی ہے جسے ہم آریاورت[3] یا ملک ہند[4] کہتے ہیں۔ اس زمین کی ہمیشہ سے یہ شان رہی کہ اس کا کوئی خطہ اور ٹکڑا کسی ایک قوم اور کسی ایک نسل سے کبھی بھرا پُرا نظر نہ آیا۔ سارے جہاں کی بوقلمونی اور نیرنگی و رنگینی اسی ایک باغ کے اندر سمٹ کر چلی آئی۔ دور دراز زمینوں کے بیج لا لا کر یہاں ڈالے گئے اور سات سمندر پار کے تازہ قلم یہاں لائے گئے۔ بھانت بھانت کا جانور اس وحشت خانہ اور رمنہ میں بولا اور چہکا۔ اُن کے زمزموں نے

---

[1] دساتیر کی بسم اللہ دیکھو دساتیر ملا فیروز پارسی مطبوعہ ۱۸۱۶ء۔ [2] کرۂ ارض [3] آریہ بزرگ۔ ورت مسکن آریہ ورت۔ آریوں کی جگہ [4] ہند اس ملک کو یہ لقب ایرانیوں نے بخشا وہ ادھر آئے تو پہلے سندھ سے سامنا ہوا۔ فارسی عموماً س کو ہ سے بدل دیتے ہیں اس لئے سندھ سے ہندہ ہوا کثرت استعمال سے گری اور ہند ہو گیا۔ یہاں کے رہنے والوں کو ہندو اور ہندی (بیائے نسبتی) کہا اور یہاں کی زبان کو ہندی لقب بخشا۔ ۱۲۔!

دنیا کے کان کھڑے کر دیئے اور ان آوازوں پر بے چین دل ادھر متوجہ ہو گئے اس باغ کی اسی روش نے اُسے ایسا سدا بہار بنا دیا کہ بیرونی دنیا آج تک اس پر مٹی ہوئی اور یہاں کی خاک سرمہ کش دیدۂ شوق بنی ہوئی ہے !

نون آرین مہاجرین اور انکی بھاکھا

یہ اسی زمین کی جاں بخش و رُوح پرور آب و ہوا اور اسی باغ کی گوناگوں رنگینی اور قدرتی شادابی و زرخیزی کا اثر و کشش تھی کہ اُسکے اطراف کی ذی حس و زندہ قوتیں اس طرف کھنچ آئیں اور اپنے مسکن اور ہجوم کو چھوڑ چھوڑ کر یہاں کی خاک سے لپٹیں اور اس پر اپنی پیشانیاں رگڑنے لگیں!

اُن خوش نصیب اقوام میں سے اوّل اوّل جن قوموں نے یہ شرف حاصل کیا وہ تین مختلف نسلوں کی یادگار تھیں جو اس باغ کے تین مشہور دروازوں سے سر جھکا کر یہاں داخل ہوئیں۔ اول تبتو برمن یہ شمال و مشرق سے ہمالہ کی برفستانی چوٹیاں پھاندتے ہوئے ادھر آئے اور اب بھی اس کے دامن میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دوم کولاریئین یہ بھی اسی راستہ سے بنگالہ میں آکودے اور پھر دکن کی طرف اُتر آئے جہاں اُن کے نشان ہنوز باقی ہیں۔ سوم۔ ڈروئیتین۔ جو شمال و مغرب (باب الہند) سے پنجاب میں آنکلے اور پھر رفتہ رفتہ کنار سمندر کی ہوا کھاتے اور کتراتے ہوئے انتہائی دکھن یعنی کیپ کومرن تک جا پہنچے اور وہاں پھیل گئے۔ تاریخی امتیاز کے لئے اُن کا نام نون آرین (غیر از آرین) رکھا گیا اور وہ پردیسی یہاں آکر اپنے گھر کی طرح رہنے سہنے لگے۔

نون آرین قوماً اور صورتاً و سیرتاً ایک دوسرے سے بالکل بیگانہ و مختلف تھے
ان کے رسم و رواج، عادات و خصائل آپس میں ملتے ہوئے تھے اور زبان و مذہب
(جن کے زور سے مختلف النسل قومیں ایک اور متحد ہو جاتی ہیں) کے سخت افتراق نے
انہیں کبھی باقوت ہونے نہ دیا اس وجہ سے کسی غیر قوم کے حملہ کے وقت کوئی زور اور
قوت نہ دکھا سکیں اور آخر فنایاب باشی ہو کر دنیا کی نظروں سے غائب اور اوجھل ہو گئیں
شروع شروع میں جیسا کہ قاعدہ ہے یہ قومیں اپنی دیسی اور ملکی زبانیں (تبتی
پہاڑی کولاری۔ تاتاری)[۲] بولتی تھیں۔ لیکن یہاں آکر ان کے اطوار و تہذیب کی طرح
وہ زبانیں بھی بدلیں اور صاف ہوئیں اور وہی اُن کی مختلف بھاکھا[۳] اور پراکرتیں[۴]
کہلائیں۔ یہ زبانیں کسی نہ کسی شکل میں اب تک باقی ہیں اور گو وہ شاخ در شاخ ہو کر ٹوٹ
ٹوٹ گئیں لیکن ایک ماہر علم اللسان اب بھی اسکی اصل تبا کر اُن کی جڑ بنیاد اور قومیت
کی خبر دے سکتا ہے۔

آرین اور سنسکرت

یہ نون ایرین ابھی اس باغ کی بہار دیکھ رہے اور اس زمین کی ہوا ہی کھا
رہے تھے کہ اُدھر وسط ایشیا کے بلیٹو سے ایک سورما قوم اٹھی جس نے اپنے قوائے داغی

---

[۱] یہاں کے جنگلوں اور کھووں میں جو قومیں مثل بھیل کول۔ مینڈا اور سنتالی وغیرہ وغیرہ نظر آتی اور وہ خانہ بدوش جو اکثر جاڑوں میں ہو کھانی ہوتے ہیں۔ وہ یہاں کی پُرانی قوموں کی نشانیاں اور یادگار ہیں۔ [۲] دیکھو تاریخ ہند از سر جان اسٹریچی و تاریخ ہند و اہل ہند از ڈاکٹر ہنٹر اور تاریخ فرشتہ وغیرہ وغیرہ۔
[۳] بھاکھا۔ بول۔ زبان۔ [۴] پراکرت۔ عوام کی زبان۔

وطاقت جسمانی کی بدولت اس وقت کی دیگر قوموں پر شرف پایا۔ ان میں کے ایک گروہ نے مغرب پر ہاتھ ڈالا اور دوسری جماعت نے اس باغ کی آرایش کا حال سن کر ادھر قدم بڑھایا۔ یہ نئی قوم جس نے خطہ آری نا (ایران) سے سر نکالا اور اس لئے آرین لقب پایا تھا اسطرف بڑھی[1] اور پنجاب کو تسخیر کرکے وہاں ڈیرہ ڈالا اور پھر رفتہ رفتہ ایک اچھے حصۂ ہند پر قابض و متصرف ہوگئی۔

نون ایرین جو زبانیں بولتے اور جن بھاکھا میں اظہار مطالب اور تبادلۂ خیالات کرتے تھے وہ مختلف تھیں اور جس طرح وہ ٹولی ٹولی اور گروہ گروہ ہوکر یہاں بسے اور آباد ہوئے اور تمدن و معاشرت میں ایک دوسرے سے بیگانہ و علیحدہ ہوگئے تھے اسیطرح اُن کی زبان کا شیرازہ بھی بکھرا اور خطہ خطہ کی پراکرتیں جُدا جُدا ہوکر اتحاد زبان کا وہ زور جاتا رہا تھا جسکی بدولت کسی گروہ کے تخیلات و مطالب میں یکسوئی و یک جہتی ہوجاتی اور پھر وہ جماعت ایک قوم بن جانے کا شرف حاصل کرلیتی ہے۔ اس وجہ سے وہ کمزور پڑگئے اور شہ زور آریوں کے آخر غلام بن گئے۔

بزرگ[2] و پاک آرین نے جب ان ناپاک اور شودر[3] نون آرین پر فتح پائی اور بے نحنت ہوکر بیٹھے تو اپنے فلسفہ و قانون و مذہب کی تدوین و ترتیب کے ساتھ ساتھ اپنی اُس زبان کی تکمیل و تہذیب کی طرف بھی جھکے جسے وہ اپنے دیس سے ساتھ لائے اور جسے اپنی جان کے برابر سمجھتے تھے۔ یہ وہی زبان تھی جو ان کے اصل وطن میں ژندبولی اور ہند میں آکر سنسکرت سمجھی گئی۔

---

[1] تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح
[2] آریہ بزرگ خاندانی۔
[3] شودر۔ نیچ ذات۔ گنوار چاکر۔

یہ مقدس[1] زبان (سنسکرت) اِن نئے حکمرانوں کی حکومت و اقتدار کی طرح بڑھی اور پھلی پھولی لیکن چونکہ ہمارے یہ مہاتما اپنے سے کم رتبہ انسان اور اپنے پر جاشودروں کے ناپاک منہ میں اپنی پاک زبان کا ڈالنا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے اس وجہ سے وہ مختلف پراکرتیں جو اِن نون ایرین کی زبانیں تھیں اور عرصہ سے یہاں جاری و ساری ہو رہی تھیں آزاد رہیں اور سنسکرت کی باندیاں نہ بن سکیں۔ عوام بدستور اپنی زبان کا مزا لیتے اور خواص اپنے ہی زبان کی چاشنی چکھتے رہے۔ لیکن ضرورت کے قانون سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اور اس لئے گو حاکم و محکوم میں گہری چھوت نہ رہی لیکن روزانہ کے کام کاج کی خاطر ایک نے دوسرے کی جانب ہاتھ بڑھا ہی دیا۔

فارسیین اور ژند[2]

یہ حالت تقریباً چار سو برس تک قائم رہی۔ سنسکرت اپنے عروج و کمال پر پہنچ کر اپنے خالص ہونے کا دعوٰے بھی کر رہی تھی کہ ان مہاتما آرین کے دوسرے بھائیوں (فارسیوں) نے اس باغ کی بہار لوٹنا چاہی۔ دارا شاہ فارس پنجاب کی طرف بڑھا[3] اور اس پر قبضہ کر کے اپنے زیر نگیں کر لیا۔ یہ نئے حملہ آور، امتداد اور دوری کے باعث اپنے دوسرے بھائیوں (ہندی آرین) کو بھول چکے اور اپنا فلسفہ و مذہب الگ قائم کر چکے تھے۔ لیکن زبان، وہ سخت جان ہے کہ قوموں اور ملکوں کے مٹ جانے پر

---

[1] سنسکرت کمل، مقدس دیوتاؤں کی زبان [2] ژند چقماق (چلمک پتھری) کا وہ حصہ جس کی زور اور رگڑ سے آگ نکلتی ہے۔ ایران کی وہ قدیم زبان جو وہاں کی مختلف پراکرتوں کی رگڑ سے شعلہ بنکر نکل آئی اپنے دیس میں وہ گو پرکالۂ آتش تھی مگر یہاں (ہند) آکر طور پر چڑھی اور آخر دیوتاؤں کے منہ میں پڑ کر نور بنی اور پوجی گئی۔ [3] تقریباً چھ سو سال قبل مسیح۔

بھی جلد نہیں مٹتی اور اس کی رُوح اور اسپرٹ عرصہ تک باقی رہتی ہے اس وجہ سے ان دونوں (فارسی آرین اور ہندی آرین) کی زبانیں جو ایک گھر کی بیٹیاں تھیں۔ تغیرات کے بعد بھی پہچان لی گئیں اور ژند سنسکرت سے اور سنسکرت ژند سے پھر گلے ملنے لپٹنے اور آپس میں شیر و شکر ہونے لگی۔

بدھ مت اور پالی

زمانہ اب سوا سو برس اور آگے بڑھ آیا۔ اس عرصہ میں ہند و ایران کی دیرینہ دوئی ہو کر یکجہتی کا یہ نیا رشتہ کھل چکا تھا اور سنسکرت اپنی دوسری بہن ژند کی طرح شائستگی و تہذیب کا جامہ پہن چکی اور عزت و افتخار کا خلعتِ فاخرہ پا چکی تھی کہ دفعتاً ملک میں ایک انقلاب عظیم برپا ہوا۔ جس سے نہ صرف سلطنت اور ہندو دھرم ہی کو سخت دھچکا لگا۔ بلکہ انکی مذہبی زبان سنسکرت نے بھی وہ جھٹکا کھایا کہ پھر پنپ نہ سکی اور جانبر نہ ہو سکی۔[۱] سنسکرت سلطنت و مذہب کی زبان تھی اور مذہب کی طرح غیروں کو اس زبان کا مزا چکھنا بھی چھوت اور منع تھا۔ سلطنت و رعایا کے مذہب و معاشرت کے

---

[۱] سنسکرت و ژند میں کچھ عجیب طرح کا تاریخی اتحاد چلا آتا ہے جس طرح یہاں بودھ نے سنسکرت کو مٹایا اسی طرح وہاں (ایران) ژند کو زرتشت (زردشت) نے خاک سیاہ کیا۔ یہاں پالی آگے بڑھی۔ وہاں پاژند نکلی۔ یہاں پھر سنسکرت ابھری وہاں بھی اردشیر نے ژند کو ابھارا۔ یہاں بھاشا اور برج بھاشا کا دور دورہ ہوا وہاں دری و پہلوی نے اپنا علم نکالا۔ یہاں بھی عربی فارسی نے بھاشا پر اپنا عمل کیا اور آخر اردو کا جھنڈا گڑ گیا۔ وہاں بھی پہلوی پر عربی کا اثر پڑا اور رفتہ رفتہ موجودہ فارسی کا پتلا کھڑا ہو گیا۔

اختلاف کے ساتھ ساتھ زبان کا فرق بھی ایسا حائل ہوا کہ حاکم و محکوم کے ادراک تخیلات اور خواہشات کسی طرح ایک نہ ہو سکے۔ اور آخر (دونوں میں) افتراق و نفاق کا بیج پڑ گیا۔ عوام جن کی تعداد ہمیشہ غالب ہوا کرتی ہے آہستہ آہستہ ابھرا اور کسی انقلاب کو دل سے چاہ رہے تھے کہ اسی عظیم الشان راج (ہندو سلطنت) کی ایک شاخ او سورج بنسی چھتریوں کے گھر سے ایک چاند (سدھارتھ) طلوع[1] ہوا جو بڑھ کر منی گوتم بدھ پکارا گیا گوتم جی جہاں کی خاک[2] سے اٹھے تھے۔ وہاں کی پراکرت اور خطوں کی پراکرتوں سے ذرا جدا تھی۔ انہوں نے (بدھ) نے اپنی دیس کی زبان اختیار کی اور عوام کے چوٹ کھائے ہوئے دلوں کو یوں ہاتھ میں لیکر ان ہی کی بھاکھا میں پند و وعظ شروع کیا۔ اسی منی (عاقل و فرزانہ) کی زبان نے پالی لقب پایا۔ یہ وہی بھاکھا تھی جس میں اس (بودھ) نے ایک عالم وجد و سرور میں (کاشی اور گیا جی کے جنگلوں کے درمیان) اپنے ساتھیوں اور چیلوں کو پکارا اور کہا کہ "دھرم کرو، دھرم کرو، دھرم کا سنکھ پھونکو، دھرم کی ڈونڈ مچاؤ!!"

ان اچھوتے اور نادر فقروں پر غور کرو اور اب انہیں پالی کہو یا پرانی بھاشا لقب دو یا ڈھائی ہزار برس کی اردو سمجھو اور آج کون ہے جو ان فقروں کے الفاظ اور مطالب کو نہیں سمجھ سکتا اور اُسے فصیح اردو نہیں کہہ سکتا!

غرض یہ زبان (پالی) بدھ مت کے ساتھ آگے بڑھی اور جہاں اگلی سلطنت

---

[1] تقریباً ۷۰۰ سال قبل مسیح [2] گوتم بدھ کے جنم بھوم میں اختلاف ہے کوئی نیپال کی ترائی بتاتا ہے اور کوئی خاص مگھ دیس (قدیم بہار) مگر یہ مسلم ہے کہ انکی تعلیم و تربیت بہار کی یونیورسٹی میں ہوئی اور راج گیر بہار میں تپسیا کی۔

اور قدیم دھرم کا نشان محو ہوا وہاں اُس پُرانی زبان سنسکرت کا نام بھی منکر ہو گیا!

یونانی

بودھ مذہب کو پھیلے اور عروج پکڑے ہوئے اور پالی کا نام نکلے ہوئے ابھی پورے ڈھائی سو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ یونانیوں نے دنیا میں سر اُٹھایا اور سکندر[۱] کی تلوار نے عالم میں خون کا مینھ برسایا۔ آریوں کا قدیم ملک (ایران) اسی کے ہاتھوں سے سر ہوا۔ وہاں کی معاشرت و تمدن میں فرق ڈالتا اور رندتا پامال کرتا ہوا وہ یونانی سیلاب باغ ہند کی طرف بڑھا[۱] اور سرحدی بند توڑتا ہوا پنجاب سے بھی آگے نکل آیا۔ اور گنگا جمنا کے کنارے آلگا سکندر نے یہاں اپنے اردو[۲] کی چھاؤنی ڈال اپنے الفاظ کے لشکر کو بھی خیمہ زن کر دیا۔!

اس کے رخصت ہونے پر سلوکس[۳] اس کا سپہ سالار ادھر کی ہوا کھانے نکلا۔ چندر گپت سے مڈبھیڑ ہوئی اور آخر اپنی ایک بیٹی دان[۳] کر کے لوٹ گیا۔ یہاں کی زبانوں اور یونان کے میل اور آمیزش بلکہ اس کے گھر کرنے کی یہ دلچسپ تاریخ ہے۔

بُدھ مت[۴] اور پالی کا زوال اور ہندو دھرم و سنسکرت کا نیا جنم

بُدھ مذہب کا منشا صرف اپنے مت کو پھیلانا تھا نہ کہ کسی خاص زبان کی ترویج و اشاعت۔ اُس نے اپنے دھرم کا سنگھ کسی ایک آلہ سے نہیں بلکہ اُن تمام آلوں سے

---

[۱] ۳۲۷ سال قبل مسیح۔ [۲] اردو معنی لشکر۔ [۳] مشہور ہے کہ سلوکس نے چندر گپت کو بیٹی دی! [۴] پالی گھر سے نکل کر برما و چین میں جا پہنچی [۵] مت ڈوکٹران - اصول

پھونکا جواسے بہ آسانی ملتے گئے اس لئے جن جن خطوں میں وہ (مذہب) پہنچا وہاں کی پراکرت میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوسکی۔ پالی مذہبی زبان بنکر سکنڈری لینگوج کے طور پر مستعمل رہی اور اس مذہب کے اخراج کے ساتھ اُسے بھی دیس نکالا نصیب ہوا۔

سنسکرت کو عام نہ کر کے ہندو سلطنت اور ہندو دھرم کو جو نقصان پہنچا تھا بودھ سلطنت اور بدھ مت نے افسوس کہ اس سے سبق نہ لیا۔ پالی بھی عام نہ ہوسکی اور اسلئے زنجیر اتحاد بغیر کسی مضبوط کڑی کے بودی کی بودی رہی اور اس کا ٹوٹنا اور بکھرنا لازمی تھا یونانیوں کے سخت حملے بدھشت سلطنت کی بنیاد کھوکھلی کر چکے تھے کہ جین مت نے بدھ مذہب کی عظیم الشان عمارت کو بھی ہلا ڈالا۔ ویدمت (ہندوازم) کو پھر جاگنے کا موقع ملا۔ اُس کی گری ہوئی دیوار اٹھائی گئی۔ ہندو دھرم میں پھر جان آئی اور سنسکرت نے بھی ساتھ ہی نیا جنم لیا۔

جو مختلف پراکرتیں یہاں بولی جا رہی اور عام ہو رہی تھیں وہ اس بیچ میں بہت زور پکڑ چکی اور بیرونی زبانوں کی مدد اور کمک پر بہت آگے بڑھ چکیں تھیں اس لئے اب جو سنسکرت میدان میں آئی تو اُسے شہ زور رقیبوں سے سامنا ہوا۔ بکرماجیت اور راجہ بھوج کے سے حوصلہ مندوں نے اُسے اگلا سا عروج و اقبال دینے میں ہر چند بڑی کوششیں کیں، لیکن اس کے درخت اقبال کو گھن لگ چکا تھا اور آخر وہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور ان مختلف پراکرتوں نے اس زمین میں جڑ پکڑ لی۔

تاتاری و ترکی

یونانیوں کے بعد[1] تاتاری اس باغ کو لوٹنے نکلے۔ پھر تورانی لپکے اور

---

[1] ۱۲۶ سال قبل مسیح سے لیکر ۴۰۰ عیسوی تک ۱۲

آخر ترکی دوڑے چنگیز و تیمور کی ترکی بھی تمام ہوئی لیکن انکی زبانوں کا زور (جیسا کہ قاعدہ ہے) تمام[1] ہوا سنسکرت ہو یا یہاں کی اور بھاکا ایسے زبردست اثروں سے کیونکر بچتیں اور آخر فارسی، یونانی، اور ترکی بھی یہاں گھر کر کے رہیں اور یہاں کی زبانوں کا ایک جزو لاینفک ہوگئیں۔

اور آج بھی اگر کوئی ان زبانوں کی تشریح کرنے بیٹھے تو اس کے جسم میں وہ غیر زبانیں رگ اور پٹھوں کی طرح ابھری ہوئی نظر آئیں گی۔

یہاں کی مختلف بھاکھا

نون ایرین زبانوں کا حال معلوم ہوچکا اور یہ بھی کھل چکا کہ یہاں سنسکرت کے آنے کے وقت تک ان کی زبانیں کیونکر صوبہ دار تقسیم در تقسیم ہوچکی تھیں اور گو سنسکرت ان کو مٹا نہ سکی مگر پھر بھی اس کے اثر سے وہ ہمیشہ گھری رہیں اور صدیوں کے انقلاب اور اس غیر زبان (سنسکرت) کے میل سے انکی اگلی سی صورتیں باقی نہ رہی تھیں۔ بیرونی اثر بھی ان پر اکثر توں پر پڑتا رہا اس لئے گو اصلی مادہ فنا نہ ہوا مگر ان کی شکل و شمائل میں فرق[2] آتا رہا۔

اس وقت تک اصلی ہندیوں اور عام لوگوں کی جو پراکرتیں موجود تھیں ان میں یہ پانچ زبانیں ممتاز ہو رہی تھیں۔ اول مہاسٹری[3]۔ دوم سوراسنی[4]۔ سوم مگدھی[5]۔

---

[1] دیکھو تاریخ ہند از لتھبرج۔ [2] دیکھو کیلوگ کی گرام۔ [3] مہاراسٹر جنوب سندھ در موجودہ سورت ذرا نیچے ایک صوبہ تھا جہاں کی بھاکھا مہاراسٹری کہلائی اور پھر بگڑ کر مرہٹی ہوگئی [4] اصل سردسنی یا سرسنی ہے سنسکرت میں سر دیا سرا کے معنی محیط کے ہیں یعنی اس بان (بھاشا) کا احاطہ اتنا وسیع تھا کہ وہ سارے ہند کو گھیرے ہوئے تھی [5] مگدھی۔ مگدھ دیس (قدیم بہار) بھاکھا جو کئی انقلابوں کے بعد پالی، بنی اور برج بھاشا میں جذب ہوگئی۔

چہارم پیساچی[1]۔ اور پنجم اپبھرنسا[2]۔

ان پانچ میں سے سوراسنی، علاقہ برج[3] (متھرا) کی بھاکھا تھی اور آگے چلکر اس نے وہ نام نکالا کہ اپنی ہمعصر باقی چار زبانوں پر حکومت کرتی اور آخر دہی یہاں کی لنگوا فرنیکا (راشٹر بھاشا[4]) بن کر رہی۔ سنسکرت نے اُسے گویا گود لیا اور اس بچہ کو اپنی زبان چوسا کر پال پوسا۔ نکالا اور وہی اس سنسکرت کی نام لیوا قائم مقام اور خلف الصدق بنی!

اسی زبان کے آخر وہ شاعر ادیب ملک میں پیدا ہوئے جن کی دماغی صلاحیت عام طور پر تسلیم ہوئی اور دیگر بھاکھا نے اس زبان کی قوت کے آگے سر جھکایا اور ڈنڈوت کی۔

برج کا سبزہ زار و مرغزار اپنی خوبی آب و ہوا اور مردم خیزی کے باعث شیراز سمجھا گیا ہے! اور وسط ہند میں واقع ہونے کی وجہ سے ہمیشہ مرکز بنا رہا ہے جو مختلف قومیں اس دیار ہند میں آئیں اور علاقوں سے زیادہ اس علاقہ کو اُن سے واسطہ رہا۔ اس وجہ سے مختلف زبانوں کا اثر اور خطوں سے زیادہ اس علاقہ پر پڑا کیا اور اس سبب سے یہاں کی زبان میں اتنی وسعت و سیری آگئی کہ اور طرف سے بے نیاز ہو کر

---

[1] ۔ پرانے نقشہ ہند (۶۵۰ء) کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ سروینی، مگھدیس (قدیم بہار) کے پچھم سے شروع ہو کر شمال میں ملتان و لاہور تک پہنچتا تھا۔ مغرب میں دریائے سندھ سے ملتا اور جنوب میں متھرا کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے اُجین تک پھیلا ہوا تھا۔

[2] ۔ دیکھو لیمبس کی گرامر انسائیکلو پیڈیا۔

[3] ۔ برج اور سندھ دونوں ہم ہوا نا تھے اس قدرتی میل کا نتیجہ آگے معلوم ہوگا

[4] ۔ راشٹر۔ ملک ۔ راشٹر بھاشا ۔ ملکی زبان ۔

اپنی ہمعصر زبانوں پر حکومت دکھانے لگی۔

عرب جس وقت ادھر آئے اسوقت یہی سوراشٹی یا برج بھاشا یہاں راج رچ رہی اور تمام ملک میں جاری وساری اور عام طور پر بولی اور سمجھی جارہی تھی اور یہاں کی لینگوا فرنیکا یا اشٹر بھاشا بنی ہوئی گویا تمہاری اردو ہورہی تھی!

عرب اور عربی

عرب اپنی آزادی وخودمختاری سے زیادہ اپنی زبان اور اپنے لٹریچر کیلئے مشہور ہیں۔ اسی زبان آوری کے بل پر انہوں نے اپنے سوا ساری دنیا کو عجم (گونگا) کہا۔ قدرت نے بھی ان کا ساتھ دیا اور جو کتاب انہیں عطا کی گئی اس کا ادب بھی دنیا میں عدیم النظیر تسلیم ہوا۔ عرب وادب دو متضاد چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ دونوں لازم وملزوم کی طرح دنیا کے ہر شعبہ اور گوشہ میں ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں۔ اُن کے صحرائی بادیہ نشینوں سے لیکر شہری اور محلوں کے مکینوں نے اُن کے علما وجہلا نے اُن کے مردوں اور عورتوں نے اُن کے بڈھوں اور بچوں نے اُن کے امیروں اور غریبوں نے اور اُن کے مولیٰ[1] وموالی[2]

---

[1] موالی۔ دیکھو امیرالمومنین علی مرتضیٰ کے خطبات۔ دُرر وغرر اور آنحضرت کا مشہور دیوان علم وحکمت کیسا مجھے جذبات وشاعری اور زور کلام وزبان انسانی قدرت سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ حضرت سیدہ کی رحلت پر ان کے فراق اور زمانہ کی شکایت میں ایک جگہ فرماتے ہیں ؎ کنا کزوج حمامۃ فی ایکۃ متمتعین بصحۃ وشبابی دخل الزماں بنا فرق بیننا + ان الزمان مفرق الاحباب یعنی ہم دونوں کبوتر کے جوڑے (اس تشبیہ سے اپنی معصومیت دکھائی ہے) کی طرح اپنے گھر میں رہتے اور صحت وشباب (یہ دونوں زندگی کی بہترین نعمتیں ہیں) سے مالامال ہوئے مگر افسوس زمانہ (نیرنگ دنیا) بیچ میں آکودا اور واقعی وہ احباب میں بڑا فرق ڈالنے والا ہے [2] موالی اس گھر کے غلاموں تک نے فصاحت وبلاغت اور زور زبان و کلام کے دریا بہادیئے ہیں جنگ کربلا میں امام سید الساجدین کے غلام حبشی کا پُرجوش رجز تاریخوں میں یادگار چلا آتا ہے

(غلاموں) نے فطرت کے اس بڑے عطیہ یعنے جذبات وشاعری کی ہمیشہ پرستش کی اور سفر میں حضر میں، خوشی میں اور رنج میں صلح کے میدان اور جنگ کے مصاف میں وہ انکی طبیعت ثانیہ بنی رہی ہے۔!

ایّام جاہلیت و وحشت میں گو وہ غیروں اور غیر زبانوں سے رَم کرتے اور صرف اپنی ہی زبان کو سراہتے رہے۔ لیکن پیرو و مقلد اسلام ہو کر وہ آزاد اور ایسے فراغ دل بنے کہ دوسروں کی زبانوں کے مزے کو بھی چکھا اور اپنے ایوانِ نعمت میں غیروں کو بھی شریک کر لیا۔ سلمان[۱] فارسی وہ پہلا غیر ملکی ہے جو کہیں کا غلام ہو کر عرب پہنچکر اور سیّدِ عرب پاس حاضر ہوکر صرف آزاد ہی نہیں ہوا بلکہ آقائے اعراب بن گیا اور فارس کی شہزادی شاہزادۂ[۲] عرب کے محل میں کنیز ہو کر نہیں بلکہ ملکہ و مالکہ بنکر رہی!!

اور ان دونوں کے اعتبار و رسوخ سے عرب اور عربی نے دوسروں پر جو اثر ڈالا اور خود جس طرح متاثر ہوئے وہ ظاہر ہے۔

تازی[۳] و فارسی

مملکت فارس اور جنگِ نہاوند[۴] جب عربوں کے بازؤں سے سر ہوئی اسوقت وہاں فارسی[۵] حکومت کر رہی تھی۔ ایرانیوں کی سلطنت مٹی اور گو عرصہ تک دفتر کی زبان

---

[۱] پڑھو سلمان فارسی کے حالات [۲] حضرت شہربانو کا عقد امام حسینؑ سے ہوا۔ شہربانو کے ساتھ انکی متعدد سہیلیاں اور لونڈیاں بھی قید ہو کر مدینہ آئی تھیں، انمیں کا زیادہ حصہ اہلبیت نبوی کے ساتھ رہا اور اس سے عربی و فارسی کا اتحاد معلوم ہو جا سکتا ہے۔ [۳] تازی۔ عربی [۴] ۲۱ھ — ۶۴۲ء۔ [۵] فارسی جسطرح یہاں برج بھاشا سنسکرت کے چشمہ سے نہاد ہو کر نکلی اور نکھری اور پھر آکر غسل ارتماسی پا کر اردو بنی۔ اسی طرح وہاں آتشکدہ ژند و پاژند سے فارسی شعلہ نکر نکلی اور آخر عربی اصطباغ پا کر ٹھنڈی ہوئی۔

فاتحین ہی کے قبضہ میں رہی مگر ملکی زبان آخر تک مفتوح نہ ہو سکی۔ فارسیوں نے مذہب تک دیدیا مگر اپنی پیاری زبان کسی حال نہیں دی۔

خوش قسمتی سے ہارونؒ و مامونؒ دو قدردان بھی اس زبان کو مل گئے اور یہ انہیں کی عربی فیاضی کا اثر تھا کہ ملک اپنی زبان نہ بھولا اور آخر الپ ارسلانؒ کے عہد میں اور عمید الملوک کے سے نیشلنسٹ کی مدد سے فارسی پھر تازہ ہوئی لیکن چار سو سال کی میعاد جھیل کر اب جو نکلی اور آزاد ہوئی تو اور ہی جامہ میں نظر آئی اور یہ وہی زبان تھی جو ترکوں اور مغلوں کی بدولت پھر اس دیار میں آئی۔ اور ہزاروں انقلاب کے بعد ملکہ فارس اور ہندی رانی کی سی بچھڑی ہوئی بہنوں میں پھر ملاپ شروع ہو گیا اور یوں ان دونوں کی وضعداری اور شرافت کا سارے عالم میں ڈنکا بجگیا۔

پرانے تعلقات میں نیا پیوند

تغیرات اور انقلاب کے آسمان نے کئی سو سال کا چکر کھایا مگر ہند و ایران کے

لہ ہارون رشید عرصہ تک فارس میں رہا اور فارسی اچھی طرح جانتا تھا۔ اسکی خاتون زبیدہ نے اپنے بیٹے امین کے مقتول ہونے پر اپنا جذبہ دل اسی فارسی میں نکالا۔ تذکرہ نویسوں نے اسکے یہ اشعار قلمبند کئے ہیں ؎ اے جان جہان ناخوش بے تو۔ بغداد پریشاں و مشوش بے تو۔ رفتی تو و من بے تو بماندم فریاد۔ تو در خاکی و من در آتش بے تو۔ جب خود بادشاہ بیگم نے اس زبان کو یوں سراہا تو پھر باقی لوگوں نے فارسی کو کہاں تک پنا آکہ زبان نہ بنایا ہوگا۔

ٹہ مامون کی ماں ایرانی تھی اور اس کی عمر کا ایک اچھا حصہ فارس و خراسان میں گذرا۔ فارسی کی ہمیشہ اس نے قدر کی اور ابو العباس مروزی کے اس قصیدہ ؎ ای رسانیدہ بدولت فرق خود بر فرق دین، گستر انیدہ بہ فضل و جود، در عالم بدین۔ پر اسے ہزار دینار انعام دیا (دیکھو تذکرہ مجمع الفصحا از مرزا رضا قلی)

۳ہ ۴۲۲ھ میں سرکاری دفتری زبان پھر فارسی ہو گئی لکھ عربی نے فارسی پر جو اثر ڈالا اس کے بیان کیلئے علیحدہ فصل و باب کی ضرورت ہے اس میں شک نہیں کہ یہ اسی (فارسی) زبان کے استخوان تھے کہ ہم صدیوں تک شکنجہ میں کسے رہنے پر بھی سالم نظر آئے اور عربی کا ہما اسکو کسی طرح نہ کھا سکا۔ ظاہری صورت میں بیشک فرق ہوا مگر اسکی سیرت و مزاج میں قابل تمیز تبدیلی نہ ہو سکی!

تعلقات و کشش کی زمین بدستور قائم رہی۔ اس بیچ میں کبھی آفتاب مشرق، مغرب زمین پر چمکا اور کبھی ہلال مغرب افق مشرق پر نظر آیا۔ یوں ان دو ملکوں کا ستارا ملا کیا اور نوشیروانی دور تک یہی گردش[1] دکھائی دی۔ اور جبکہ رانی پشتاونی کے گھر کا چاند اور ایدر کا آفتاب ایک ساسانی شہزادی[2] کو اپنے برج و منزل میں لے آیا تو اتحاد زبان کا ستارہ اور چمکا اور فارسی و ہندی کا قرآن السعدین شروع ہو گیا۔

عرب ہند میں

عرب، ایران سے فرصت پا کر اپنے ہمسایہ ملکوں کی طرف بڑھے۔ فتح نہاوند[3] سے ۸ برس بعد ہوائے باغ ہند سر میں سمائی قلعہ[4] ہرات یعنی دروازۂ ہند کھولا گیا۔ اور پھر کابل[5] پہنچکر وہ ملتان اتر آئے اور وہاں ڈیرے ڈالدیے۔ شمال و مغرب کے پہاڑ ادھر اس ہلچل سے گونج رہے تھے کہ ادھر انکی ایک جماعت دریائے سندھ عبور کر کے راجپوتانہ کے ریگستان میں گھس آئی۔ محمد علافی[6] ایک عرب نژاد بھی اسی زمانہ میں اپنے جیش سے علیحدہ ہو کر اپنے رفقا ہمیت ادھر آیا اور ہندی بن کر اس نے راجہ داہر[7] سے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے ان دو پرانی قوموں اور زبانوں (ہندی و عربی) کا ملاپ قدرتاً قائم ہوا تھا کہ محمد قاسم[8] کی کمک نے اس رشتہ کو اور مضبوط و محکم کر دیا۔!

---

[1] نوشیروان کی فوج ایک مرتبہ گجرات کی راجدھانی (ولبھی پور) تک بڑھ آئی تھی جنگ و صلح کے بعد تعلقات اور رشتے قائم ہو گئے [2] نوشیرواں کی پوتی راجہ ایدر کو بیاہی گئی۔ [3] ۲۱ھ / ۶۴۲ء
[4] ۳۸ھ / ۶۵۸ء (خلافت علی مرتضیٰ)
[5] ۴۱ھ / ۶۶۱ء۔ [6] پڑھو محمد علافی کا حال [7] آخر فرمانروائے سندھ جس نے قاسم کے ہاتھ سے شکست پائی۔ [8] ۹۱ھ / ۷۱۰ء

کچھ نئے تعلقات

راجہ داہر کی جنگ و شکست پرانی تاریخ ہند کا آخری ورق اور عربی و ترکی و ایرانی خروج کا دیباچہ اور غیر اقوام سے نئے ارتباط و تعلق اور پائدار رشتہ کے پیدا و قائم ہو جانے کا دلچسپ عنوان ہے اِس ملک میں اب تک باہر کی بیٹیاں[1] آئیں اور اپنی زبانیں ساتھ لائیں تھیں۔ مگر اب ہوا اُلٹی اور ہند کی بیٹیاں[2] بھی باہر نکلیں اور اس اِکسچینج کی بدولت زبانوں کا سکّہ دونوں جگہ کرنسی ہونے اور چلنے لگا؟!

عربی اور ہندی

قاسم تین برس تک سندھ میں رہا اور اپنی ملکہ رانی کی بدولت یہاں کا ہو گیا[3]! اس کے اکثر ساتھیوں اور لشکریوں نے یہاں وصلت[4] کی اور گھر بنا کر رہنے اسکے

---

[1] سلوکس (سپہ سالار سکندر) کی بیٹی و دختر ساسانیان یہاں آئیں [2] راجہ داہر کی رانی لاڈی محمد قاسم کے عقدِ نکاح میں آئی، حاکم دیبل کی بیٹیاں حجاج (امیر وقت) کے پاس بھیجی گئیں اور قلعہ راور (الور) کے سر ہونے پر علاوہ ۳۰ ہزار لشکری قیدیوں کے تین ہندی شہزادیاں اور راجہ داہر کی سگی بھانجی جیسیہ بھی عراق لائی گئیں اور ان جیسیہ کا نکاح عبداللہ ابن عباس سے ہوا اور پھر اسی راج کی دو اور شہزادیاں (سوریا دیبی و پرمل دیبی) خلیفہ وقت کے محل میں داخل ہوئیں! (دیکھو چچ نامہ و تاریخ میر معصوم) [3] قاسم کی واپسی اہل ہند پر بے حد شاق ہوئی انہوں نے غم و ماتم کیا اور آخر (بطور یادگار) اس کا بت بنا کر رکھا اور اسکی پوجا کرتے رہے (دیکھو چچ نامہ فتوح البلدان و تاریخ میر معصوم) [4] اہل عرب اپنے ملک کے باہر اپنی عورتوں کو نہیں لیجا سکتے تھے اور نہ انہیں غیر ممالک میں زراعت وغیرہ کا اختیار تھا (دیکھو احکامات خلفاء) اسوجہ سے جہاں وہ جاتے مجبوراً وہاں کی عورتوں سے تعلق پیدا کرتے اور جو زمینیں انہیں صلہ جنگ میں ملتیں اس کا بندوبست وہ وہاں کی رعایا ہی کے ساتھ کرتے یہ دونوں صورتیں وہ تھیں جن سے اہل ملک کے ساتھ ان کے تعلقات ہمیشہ اچھے رہتے تھے۔

جانے پر عرب کا قافلہ ٹوٹا اور بزار سندھ بزار عکاظ نظر آنے لگا۔ عرب فتح فارس سے بہت سبق سیکھ چکے تھے۔ اور نو واردین کو غیر ملک میں جو دشواریاں عموماً پیش آیا کرتی ہیں اُس کا تجربہ رکھتے تھے۔ زبان کی دقتیں سب دقتوں پر ہمیشہ بالا ہوا کرتی ہیں وہ اُسے بھی خوب جھیل چکے۔

اور جس ملک کو انہوں نے ہمیشہ گونگا (عجم) کہا اس کے آلہ زبان سے بھی آخر کام لے چکے تھے۔ یہاں کی مشکلیں ان کے لئے آسان تھیں۔ انہوں نے بلا تعصب و حقارت اپنی مفتوحہ زبان کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے بھی پہلو میں لا بٹھایا! خوش قسمتی تھی سندھ کی کہ اسے عرب جیسے فراخ دل و قدرداں ملے!

جنہوں نے محض اپنی زبان کا زور اور فاتحانہ قوت دکھانے اور صرف اپنے ہی ارگن (زبان) کو وقت ناوقت بجاتے رہنے کی ہوس میں کہیں کی شہناء (زبان) کا کلیجہ نہ چھیدا۔[۱]

وہ خود صاحب زبان اور ادب ولٹریچر کے مالک تھے۔ اسلئے وہ دوسری زبانوں اور دوسرے لٹریچر کی قدر کر سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کسی قوم کو اکمن کر دینا اسکی ہستی کو معدوم کر دینا ہے اور اس لئے ان میں کوئی ایسا بیدرد پیدا نہوا جس نے اپنی ہوم گورنمنٹ کو کسی ڈسپیچ کے ذریعے سے اُس قوم کی زبان کی تحقیر و تذلیل کی ہو! انکی (عرب) زبان گو اس وقت علوم و فنون کی نہر لبن[۲] بنی ہوئی تھی

---

[۱] سویلزیشن اور کلچر کے مدعی آج کیا کر رہے ہیں؟ بلجیم کی نرم و شیریں زبان (فرینچ) اس کھینچکر اب وہاں ایک کرخت و فولادی زبان جرمنی ٹھونسی گئی ہے۔

[۲] ۔ عربوں کا قبضہ سندھ و ہند پر تین سو سال سے زیادہ رہا اور اسی مدت میں اپنے ادب و لٹریچر کو انہوں نے باہر کے خزانوں سے بھی مالامال کر دیا تھا۔

مگر انہوں نے محض اپنی آسانیوں کی خاطر دوسروں کی گردنیں اُدھر نہ جھکائیں وہ سمجھتے اور حق سمجھتے تھے کہ یہاں کی زمین کے شکم میں خود شہد و شیر کی نہریں موج مار رہی ہیں یہ ملک خود اپنے رُواۃ (ٹریڈیشن) اور اپنا سویلیزیشن رکھتا ہے اور اس کا ادب و لٹریچر دنیا میں ممتاز رہا ہے اسلئے اسکی قدر کی اور ایک پرانی قوم کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین نہ ہونے دیا!

دوسری طرف ہندی بھی غیر اقوام اور غیر زبانوں[1] کے صدیوں سے عادی ہو رہے تھے۔ عربی نئی ہو مگر غیر زبانوں کا چھینٹ اُن کی زبان کے خمیر میں آ چکا تھا۔ اُن کے کان بیرونی لب و لہجہ اور حروف کے مختلف اصوات سے آشنا ہو چکے بلکہ اُن کے حلق و دنداں تک اُن آوازوں کھٹکوں اور شعبوں کے مخارج بن چکے تھے اسکے علاوہ خود ان کے ملک میں کئی کئی زبانیں اس وقت تک رائج تھیں اور وہ انہیں بے تکلف سمجھتے اور بولتے بھی تھے۔ ایسے ہفت زبانوں کے لئے ایک عربی کیا مشکل تھی۔ انہوں نے اس کا بھی خیر مقدم کیا اور اپنے گھر میں اُسے بھی جگہ دی!

وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ حکومت کسی بیجا مقراض سے ہماری زبان کاٹنا نہیں چاہتی وہ (حکومت) خود اسطرف بڑھ رہی ہے اور ہماری اسکی مشکل برابر کی ہے۔ انہیں (اہل ہند) اس کا بھی علم تھا کہ ہمارے فاتحین کی زبان پہلے ایک ہی سمندر تھی اور اب تو قلزم[2] بن رہی ہے اُس سے اپنے چشمہ کی سوتوں کو

---

[1] یونانی، ترکی اور فارسی [2] یہی زمانہ ہے کہ یونانی علوم و فنون بھی عربی میں لائے جا رہے ہیں اور ہندوؤں کا فلسفہ اور ان کا علم جوتش عرب میں پڑھا جا رہا اور ترجمہ ہو رہا ہے۔ منکا اور صالح نے عہدِ ہارون میں اور میکہ و ابن داہان نے زمانہ مامون میں ہندی طب (ویدک) کے ترجمے کئے عرب میں اسوقت چرک و سسرتا کے طبی تالیفات عام ہو چکے تھے۔

ملانا اور بڑ کرنا چاہئے۔ بے اطمینانیوں اور غلط فہمیوں کا راستہ کھلا نہ تھا۔ دونوں اپنے حدود کو سمجھ کر آگے بڑھے اور کوئی تصادم نہ ہوا۔ اور یوں عربی و ہندی کی آمیزش شروع ہو گئی!

یہ اسی بے تکلفی و یک جہتی کا نتیجہ تھا کہ خلفائے عرب کے عظیم الشان دربار تک یہاں کے علماء و فضلا، حکیموں اور پنڈتوں کی رسائی ہوئی اور اہل ہند کا اتنا اعتبار و رسوخ بڑھا کہ ہارون رشید نے کنکا بانک، بابا کبیراج کو اپنے علاج کے لئے یہاں سے طلب کیا اور اسے عزت و افتخار کی کرسی بخشی[۱]!

یہی وہ زمانہ ہے کہ عرب سیاح اس ملک کی سیر کو آتے اور یہاں سے خوش خوش جاتے ہیں۔ مسعودی[۲] بھی ان ہی دنوں میں ادھر آیا اور اس ملک اور اہل ملک کی تعریف کرتا ہوا واپس گیا۔ ابن حوقل[۳] اس کے بعد یہاں کی سیر کو آتا اور ہندو مسلمانوں کے رشتۂ اتحاد کو خوشی مگر حیرت کے ساتھ دیکھتا اور کہتا ہے کہ ان دو قوموں (ہندو مسلمان) کے لباس، تمدن و معاشرت اور ان کی رفتار و گفتار میں فرق و امتیاز مشکل ہے۔ دونوں یک ہی زبان بولتے ہیں۔!

سندھ اور دیگر اضلاع میں عربی اور ہندی بولی جاتی اور ملتان میں ملتانی و فارسی عام ہے!!

برج بھاشا سندھی اور یہاں کی دوسری پراکرتیں!

جغرافیہ[۴] قدیم کی رو سے سندھ و برج کا ڈنڈا ملا ہوا تھا اور اس وجہ سے دیگر

۱؎ دیکھو طبری ۲؎ در عہد سلطان مسعود ۳۰۴ھ دیکھو مروج الذہب۔ ۳؎ در زمانۂ المطیع باللہ عباسی
۴؎ دیکھو نقشۂ ہند ۹۱۵ء ۶۲۹ھ و ۶۴۳ھ و آئین اکبری۔

صوبجات سے زیادہ اُن دونوں خطوں میں اختلاط و مراسم تھے۔ مرغزار برج کی کوئل یوں تو کہاں نہیں کوکی اور کس دل کو اُس نے اپنی طرف نہیں کھینچا۔ مگر سندھ اس کا پائین باغ تھا۔ وہاں اس وقت سب سے زیادہ اثر پڑا۔ وہ بلبل ہند (بھاشا) جو باغ باغ اور چمن چمن کے پھول[۱] اپنی منقار میں لئے ہوئے تھی۔ جب اڑ کر اُدھر پہنچی تو اپنے گلدستہ کے لئے عربی کے گلِ سرسبد بھی اُس نے چنے اور اپنے آشیانہ میں سجا کر رکھے۔

سندھی[۲] ہو یا یہاں کی اور پراکرتیں وہ خود رو تھیں، لائق باغبانوں نے بھی انہیں ہاتھ نہیں لگایا اور نہ باہر کے چشموں نے انہیں سینچا۔ اس لئے وہ مرجھائیں اور بے برگ و بار رہیں۔ برخلاف اس کے برج بھاشا کاٹ چھانٹ کر درست کی گئی اور پھلدار میوہ دار بنی۔ شعراء اور ادیبوں نے اسکی آبیاری کی۔ وہ بڑھی گھنی ہوئی اور ہر طرف چھا گئی اور پراکرتوں کے ساتھ سندھی بھی اُس سے دبی اور آخر اُسی کے زیر سایہ رہنے لگی۔

---

۱ ۔ سنسکرت، یونانی، ترکی اور قدیم فارسی۔

۲ ۔ سندھ و گجراتی وغیرہ آج تک رائج ہیں۔ مگر وہ پراکرتیں ہیں۔ زبان (لینگواج) کا درجہ نہیں رکھتیں جن اثروں سے شمال و مغرب بلکہ پورب (اگھدیس) تک کی پراکرتوں میں انقلاب ہوگیا اور برج بھاشا بیچ میں کود کر آگے بڑھی اور ہر طرف چھائی اور پھر اس نے اردو کا لقب اختیار کیا اسی طرح جنوب ہند کی مختلف پراکرتیں کمزور اور ایک دوسرے میں جذب ہوکر اور بیرونی اثرات سے دبکر ایک نئی شکل میں اُبھریں۔ اس نئی صورت کا نام دکھنی پڑا اس کی ساخت و ترکیب بھاشا اور اردو سے مختلف نہ تھی اور آخر میں وہ بھی اردو میں ضم ہوگئی۔ موجودہ سندھی و گجراتی اسی دکھنی (یا جنوبی اردو) کی کھرچن ہیں اس لئے انہیں کوئی مستقل زبان سمجھنا اور اردو سے مختلف جاننا نادانی ہے۔

برج بھاشا اردو بننے کے لئے تیار ہوتی ہے!

اس ملکۂ ہند (راشٹر بھاشا) کے قلمرو میں اب عربی[1] کا وسیع میدان بھی آگیا تھا زبان اور الفاظ بھی موسمی تغیرات کے تابع ہوتے ہیں اور جس طرح فصل بدلتی اور اشجار پرانے رخت اتار کر نیا جوڑا پہنتے ہیں اسی طرح زبان اور لفظوں کا بھی ایک زمانہ ہوتا ہے فصل گذری، رُت بدلی اور زبان کے درختوں نے بھی نئی کوپلیں نکالیں۔ ہماری بھاشا کے چمن میں بھی ایسے بہت سے نوروز آئے کبھی اسکی کیاریوں میں اپنے ساگ[2] پات کے ساتھ صرف سنسکرت ہی کے پھل پھول نظر آئے۔ کبھی یونانی و ترکی کے میوہ دانے لٹکے اور کبھی انگور شیراز کے رس ٹپکے۔ انکی بہار خزاں پر تھی کہ عربی خرمے زینتِ چمن ہونے لگے۔ یہ وہی تازہ میوہ تھا، صدیوں تک جس کا مزا زبانوں پر رہا اور اسکی چاشنی مدتوں قائم رہی۔

مبصرین جانتے ہیں کہ طفل زبان کی نشو و نما دنوں میں نہیں بلکہ صدیوں میں ہوا کرتی ہے۔ یہی حال اپنی اس بھاشا کا بھی سمجھو ایک وقت میں وہ معمولی پراکرت بنی ہوئی اپنی ہی کملی میں مست تھی۔ زمانہ کی ہوا نے وہ گدڑی اتاری اور سروسنی کا خلعت بخشا مگر مدتوں اسے باہر کی ہوا نہ مل سکی۔ صدیوں بعد وہ آزاد ہوئی۔ بڑی ہو کر

---

[1] عرب سندھ و نواح سندھ بلکہ تعلقات کی وجہ سے شمال و مغرب ہند و مغرب اور یورپ میں بھی تین سو برس سے زیادہ رہے اور اہل ہند ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں عراق و عرب میں آگئے دونوں کے سولیزیشن اور زبانوں کا اثر ایک دوسرے پر کیونکر نہ پڑتا اور قانون فطرت سے کوئی قوم نکل کیونکر سکتی ہے۔ [2] شروع میں معمولی پراکت ہونے کی وجہ سے بھاشا کے چمن میں مقامی ساگ پات کے سوا اور کیا تھا۔ یہ تو سنسکرت نے اسے گود لیکر اسکی قدر و قیمت بڑھائی۔

گھر سے نکلی۔ جگہ جگہ اپنی گٹھری کھولی اور شہروں شہروں سے سوغاتیں لائی۔ خود اپنی گرہ میں کیا کچھ نہ تھا۔ وساور کے مال نے رئیس بنایا اسی ریاست وامارت کے زمانہ میں عربی کے خزائن بھی ہاتھ لگے اور اب امیر کبیر بن بیٹھی[۱]

عربی نے بھاشا سے جو کچھ لیا وہ تو یہیں کی ملک[۲] ٹھہرا اور بھاشا نے عربی سے جو کچھ پایا وہ بھی اسی زمین کا حصہ ہوا۔ اسی صاف وجائز لین دین کی بدولت جس طرح سندھ خالص میں عربی و ہندی ایک ہو رہی تھی اسی طرح کچھ دنوں بعد مغربی وشمالی ہند میں بھی وہ دونوں شیر وشکر دکھائی دینے لگیں اور یہ اسی اختلاط واشتراک کا نتیجہ تھا کہ عام لوگوں سے گذر کر عربی بھی ادیبوں اور کویوں[۳] کے شیریں دہنوں سے ٹپکنے اور آخر دیوتاؤں[۴] کے پاک منھ سے بھی جھڑنے لگی۔

اسی اختلاط کا نام کسی زبان کی ترقی و وسعت اور مدارج طے کر کے کسی خاص بام تک اُس کا پہنچنا ہے۔ ہماری بھاشا کی یہی وہ تدریجی ترقی و وسعت تھی جس نے پردیسیوں کو بھی پرچا کر اپنا کر لیا۔ اور انکی بے تکلف زبانوں سے آخر

---

[۱] بھاشا کی تعریف یہی ہے کہ اسمیں یہاں کے ہر خطہ اور قوم کے الفاظ و محاورات بہ کثرت موجود ہیں اور اسی وجہ سے اس ایک زبان کا جاننے والا اس وسیع براعظم میں ہر جگہ اپنا کام بآسانی نکال سکتا تھا۔ دوسری پراکرتیں اس سے ہمیشہ دب جایا کرتیں اور آخر اسی کا بول بالا ہوتا اور یہی تمام راج رہتی۔ اسکی ملنساری نے جب باہر کے لفظوں (عربی، فارسی، ترکی) کو بھی جذب کیا اور اس کا اردو نام پڑا تو اس اردو کی بھی وہی حیثیت قرار پاگئی

[۲] ظاہر ہے کہ عرب یہاں مقیم ہو گئے تھے۔ یہاں کے الفاظ اپنے ملک میں کیونکر لیجاتے جو کچھ یہاں انہوں نے سیکھا وہ بھی یہیں نذر کیا۔ [۳] کوی سنسکرت و بھاشا میں شاعر کو کہتے ہیں [۴] پڑھو پرانے مذہبی نثر علمی کتنیں اور اخلاقی کہاوتیں

ایک نیا خطاب (اردو) پاکر اسے تسلیم کر لیا۔

اس ترقی یافتہ بھاشا (اردو) کی تاریخ ترکوں اور مغلوں کے وقت سے نہیں بلکہ اس سے کئی صدی پیشتر یعنی اصل عربوں کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔!

اور اسی مبارک عہد سے ہماری بھاشا کا رجحان و میلان ایک خوشگوار انقلاب اور اُس ایوولیوشن کی طرف نظر آتا ہے جس کی تکمیل پر ایک دو نہیں چند در چند اور مختلف قوموں کے بکھرے ہوئے تار ایک رشتہ میں جڑ کر مضبوط و مستحکم ہو گئے۔

نئے سیاح اور بھاشا کی فتح

وسط اور مغربی ہند کی پرانی اور نئی[1] قومیں گردنوں میں ہاتھ ڈالے ابھی سکھ نیند سو رہے ہیں اور طفل بھاشا بھی اپنے گہوارہ میں جھول رہا اور اپنی دونوں اناؤں اور دایوں کی میٹھی لوریاں سن رہا تھا کہ یکایک دنیا کے ایک حصہ میں پھر ہیجان شروع ہوا۔

زمانہ کئی صدی آگے بڑھ آیا۔ عربی و ایرانی علم ٹھنڈے ہوئے اب ترکوں کا پرچم چمکا۔ آل سامان[2] کی بے سروسامانی نے اُس گھر کے ایک غلام الپتگین کی کمر کسوائی اور غزنی و کابل پر ہاتھ مار کے اس نے پرکا کھولا۔ سبکتگین[3] اس کا جانشین گھر کا بندوبست کر کے باہر کی ہوا کھانے نکلا۔ باغ ہند بغل میں تھا، پہلے ادھر متوجہ ہوا[4]۔

---

[1] عرب و ہندی [2] سامان ایک پارسی امیر تھا مسلمان ہوا اور اس کی اولاد عباسیوں کے وقت میں بڑھی اور رفتہ رفتہ مشرقی ایران پر قابض ہو گئی [3] سبکتگین غلام الپتگین۔ مگر کہتے ہیں کہ وہ شاہ یزد جرد کی نسل سے تھا۔ [4] ۳۶۷ھ ہجری۔

راجہ جے پال سے دوبدو ہوئی۔ جنگ صلح و پیمان سے بدلی اس پیمان کی شکست پر سبکتگین جھلایا ہوا پھر لوٹا اور اب کے اس باغ کا دروازہ زبردستی کھول لاہور بلکہ اٹک تک دریا کی طرح بڑھا چلا آیا۔

محمود اس کا فرزند یہاں کی بہار پر غش تھا۔ باپ کی جگہ لیتے ہی اِدھر کی ہوس بڑھی اور وہ سترہ[1] دفعہ پوری ہوئی۔

اس کی یہ گلگشت، کچھ نئی بہاریں ساتھ لائیں اور ہند و ترک کے تعلقات کا نوروز پھر شروع ہو گیا۔

اتحاد زبان اور اتحاد خیالات کا جو بیج وہ بو گیا وہ آخر پھوٹا پھبکا درخت بنا اور بڑھکر رفتہ رفتہ اتنا گھنا اور عظیم الشان ہو گیا کہ کوئی باد مخالف آٹھ سو برس تک اُسے ہلا نہ سکی۔!

یہ اُسی کی سیاست و مردانگی تھی کہ یہاں سے (راجہ) جیپال مہمان بنکر غزنی گیا اور یہ اُسی کی حوصلہ مندی تھی کہ بھٹنڈہ لے کر پھر یہیں کے ایک راجہ (سکھ پال) کو حوالہ کر گیا۔ یہ اسی کی فراست تھی کہ ہندی سپاہی اُس نے اپنی فوج میں بھرتی کئے اور ہند و خراسان کی راہ کھول کر دونوں کو ایک کر دیا یہ اسی کی سچی دوستی اور مروت تھی کہ جب راجہ کنور رائے نے اپنا ملک قنوج حوالہ کر کے اس سے بھائی چارا قائم کیا تو پھر محمود اسکی امداد پر تل گیا اور کلانجر والوں نے جب قنوج کو روندنا چاہا تو وہ (محمود) اپنے دوست کی کمک پر غزنی سے آندھی کی طرح اٹھا اور کلانجر والوں پر گرجا اور برسا!!

---

[1] محمود ۳۹۰ھ ۱۰۰۰ء میں ادھر آیا اور اسکے سترہ حملے مشہور ہیں۔-۱۲

سومنات کا افسانہ سنتے سنتے کان کر ہو گئے اور انگریزی درسی تاریخوں نے ہمارے بچوں کو محمود سے عداوت و نفرت رکھنے کے سوا کچھ نہیں سکھایا!

اس لیٹرے کے سلوک و رواداری کا چرچا بھی کہیں سنا ہو تو بولو اور کبھی یہ بھی بتایا گیا ہو تو کہدو کہ اسی سومنات کے لوٹنے پر اس کا سیر حاصل علاقہ وہ (محمود) کس فیاضی سے یہیں کے ایک پنڈت و اشلیم کو تفویض کر گیا۔

شاہنامہ فردوسی کی داستان بھی سنی اور حسن میمندی کو چھوڑ کر ہجو محمود زبان زد خاص و عام ہو گئی۔ مگر بہت کم آنکھوں نے محاصرہ گوالیار اور راجہ نندا رائے کے نتیجہ خیز واقعہ[۱] کو دیکھا۔ جب یہ (محمود) گوالیار[۲] پر چڑھا اور قلعہ پر سخت محاصرہ ہوا تو وہاں کے (راجہ نندا رائے) نے صلح کی درخواست کی اور ہزار لالچ دیئے مگر محمود اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ آخر راجہ نے اپنی بھاشا میں ایک قصیدہ نظم کر کے اُسے بھیجا۔ محمود پر اس نظم کا وہ اثر ہوا کہ اُس نے قلعہ ہی سے ہاتھ نہ اٹھایا بلکہ پندرہ اور اپنے مفتوحہ قلعے اس راجہ کو بخش کر واپس چلا گیا!!

ہمارے مخدوم بابو نریندرا ناتھ (ام اے) اپنی کتاب ترقی علوم و فنون در زمان مسلمان بادشاہانِ ہند میں اس نتیجہ خیز واقعہ کو نقل کر کے کیا خوب کہتے ہیں کہ دنیا میں آجتک کسی زبان و لٹریچر کی ایسی فتح و فیروزی اور کسی فاتح کا ایسا عمدہ مذاق نہ کانوں نے سنا اور نہ آنکھوں نے دیکھا[۳]!

یہی وہ بھاشا تھی جس نے یوں ملکِ دل چھینے اور یہی وہ مشترکہ زبان تھی جو

---

[۱] دیکھو طبقات اکبری [۲] سنہ ۱۰۲۳ء [۳] دیکھو پروموشن آف لرننگ اِن انڈیا ڈیورنگ محمڈن رول بائی محمڈنس، مطبوعہ لونگمنس گرین لنڈن سنہ ۱۹۱۶ء

محمود کے وقت تک اتنی سیر ہو گئی کہ ایک ترک پر یوں قبضہ کر بیٹھی !!

یہ محمود ہی کی تربیت کا اثر تھا کہ مسعود (اسکے فرزند) نے اور لوازماتِ سلطانی کے ساتھ ہند کے تعلقات کو بھی قائم رکھا اور میچوال کونفی ڈنس کو ہمیشہ بڑھاتا رہا اس کا ہندی رسالہ اور اس کا افسر سپاہ سونیڈ رائے سلطان کا معتمد حملۂ کرمان وہرات میں پیش پیش تھا۔ اس تعلق و اعتماد کو یہیں پر ختم نہ سمجھو۔

صرف بیس پچیس سال کی آمد و رفت اور شناسائی میں ایک شریف قوم دوسری شریف قوم پر وہ اعتماد و بھروسہ کرتی ہے جیسے آج ہندوستان ہاتھ پھیلا پھیلا کر مانگ رہا ہے اور جو اُسے آج سے ہزار سال قبل بے مانگے حاصل تھا!

حضور وائسرائے جے پور تشریف لے گئے تھے وہاں انہیں اکبر اور راجپوتوں کے پرانے تعلقات بے اختیار یاد آئے اور وہ راجہ مان سنگھ کی سروری و سرداری کا تادیر ذکر فرماتے رہے۔[لے]

اسیر ہمارا بنگالی (اخبار) نوٹ لکھ کر موجودہ حکومت کو اکبری اعتبار و بھروسہ کا سبق پڑھاتا ہے۔ مگر شاید اُسے یہ معلوم نہیں کہ اکبر اس کا موجد نہیں بلکہ محمود کا فرزند سُلطان مسعود اس کا بانی ہے!

تاریخ دونوں پر پوشیدہ نہ ہوگا کہ محمود پنجاب اور اطراف پنجاب کو اپنی سلطنت میں داخل کر کے اپنے امور میں الجھ گیا اور پھر ادھر کی خبر نہ لے سکا سلطان مسعود نے پھر ہند کا خیال کیا۔ احمد نیال یہاں کی گورنری و سپہ سالاری پر بھیجا گیا لیکن سُلطان کو اُس کے کاموں سے تشفی نہیں ہوئی اور نظم و نسق ہندوستان کے لئے

لے - پڑھو حضور وائسرائے کی جے پور والی اسپیچ - ۱۲ -

کسی معتمد کے بھیجنے کی فکر ہوئی رائے و مشورہ کے لئے کونسل بیٹھی اور سب نے بالاتفاق ایک ہندو سردار تلک[1] کو (جو وہاں حاضر دربار تھا) پیش کیا سلطان نے یہ رائے پسند کی اور سردار تلک سپہ سالار و گورنر کل ممالک محروسہ ہندوستان مقرر ہو کر بڑے حشم و حشم کے ساتھ ادھر بھیجا گیا!!

یہی وہ اتحاد و اتفاق تھا جس نے دو مختلف قوموں کو متفق کر کے اُن کی زبانوں کو بھی آخر ایک کر دیا! بیرونی[2] اسی وقت میں اپنے اصلی وطن ہند کی زیارت سے مشرف ہوا اور یہاں سے علوم اور زبانوں کے وہ ذخائر لے گیا کہ ایران و ترکستان میں مدتوں اُن کا چرچا[3] رہا اور ہندی و فارسی پھر اس طرح بھٹنا اور مخلوط ہونا شروع ہو گئی۔

فارسی کا یہاں گھر کرنا اور ہندی سے پہناپا!

ہندی اختلاط و ارتباط کا حال بھی تم پڑھ چکے اور مسعودی و بیرونی فارسی

---

[1] تلک ندہبًا و قومًا ہندو تھا۔ محمود کے پیدا کردہ تعلقات نے اُسے غزنی پہنچایا وہاں اس نے قاضی ابو الحسن کے آگے زانوئے شاگردی طے کیا اور پھر دربار مسعود میں پہنچکر عزت و افتخار کی کرسی حاصل کی۔

[2] بیرونی (ابوریحان) سندھ کے ایک شہر بیرون میں تقریبًا ۳۶۰ھ / ۹۰ء میں پیدا ہوا تحصیل علوم کا شوق اسے عرب و ایران لے گیا۔ شاہ فارس شمس المعالی قابوس نے اسکی عزت کی اور اپنا وزیر بنانا چاہا۔ مگر اس تشنۂ علم کی اس عہدہ سے کیا سیری ہوتی۔ وزارت سے انکار کر کے محمود پاس چلا آیا اور اپنے علمی تحقیقات و تصانیف میں مصروف رہا اور اپنے اصلی وطن ہند کی سیر و سیاحت پر کمر باندھی ادھر آیا اور عرصہ تک یہاں رہکر یہاں کے علوم (مذہب فلسفہ اور نجوم و طب وغیرہ) حاصل کر کے پھر ترکستان و ایران چلا گیا اور وہاں اپنے معلومات سے فائدہ پہنچاتا رہا۔ بیرونی پرانوں کے فلسفہ مذہب کا عاشق اور بھگوت گیتا کا بیحد ادب کرتا ہے۔ [3] دیکھو کتاب الہند از بیرونی ۱۲-

و ہندی ملاپ کی تاریخ بتا چکے محمود و مسعود نے اس یکجہتی کو بڑھایا لیکن جب تک غوری جم نہ لئے اور اوچہ[1] کی راج کماری شہاب الدین کے محل میں داخل نہ ہولی ہندو مسلم اتحاد اور ہندی فارسی اختلاط ترقی نہ کرسکا اور جب تک ترکی غلام یہاں کی خاک پاک کا قشقہ کھینچ اس دیر میں آسن جما کر بیٹھ نہ گئے یہ آقائے ہند نہ بن سکے اور فارسی ہندی کا ریختہ پختہ نہ ہوسکا۔ یہ غلام شاہوں کا دل و دماغ لائے تھے اس زمین کے ساتھ انہوں نے شاہانہ سلوک کئے اور حسن ادب و انشا نے عجم کو گویا اور انہیں (ترک) دنیا میں رسا کیا اُسے زینتِ تاج و تخت سمجھتے اور خلوت و دربار میں ہمیشہ بار دیتے رہے۔

ان ہی کے وقت میں دکھن و بنگال و فارسی کے زیر نگیں ہوا اور دلی زبانوں کا مرکز اور علوم کا گھر بنی ہوئی غزنی و بغداد پر چشمک زن ہو رہی تھی عربی و ایرانی فضلا و امراء کے ساتھ شعراء و ادبا کی آوازیں بھی دار الامارت کے ہر گلی کوچہ میں گونج رہی نئے اور پرانے خیالات مصافحہ کر رہے اور مہمان و میزبان کی زبانیں گلے مل رہی تھیں کہ سلطان بلبن[2] کا مبارک وقت آپہنچا اور میر خسرو کا طوطی زبان بولنے اور چہکنے لگا۔ رنگ محل کا شناسا ان سے بہتر کون تھا اپنی خالق باری کے پردے میں وقت کا ساز چھیڑ کر صحبت گرما گئے اور خالق باری سرجن ہار ÷ واحد ایک ڈرا کرتار سے بسم اللہ کرکے دونوں زبانوں کے ساز باز ہی کو

---

[1] دیکھو فتح اوچہ کے حالات [2] ۶۶۴ھ / ۱۲۶۶ء یہ بلبن ہی کا زمانہ تھا کہ شہزادگان و امرائے ترک و ایران جوق جوق یہاں آئے اور دلی کا گلی کوچہ انکے ناموں سے آباد ہوگیا۔ فضلا و شعراء ایران سے دربار سلطان ہمیشہ بھرا رہتا بادشاہ خود ادیب شاعر تھا اور اسکے بڑے بیٹے سلطان محمد کے علم و فضل اور شاعری سے عشق کی حکایتیں آج تک مشہور ہیں۔

ہنیں بلکہ وہ مذہبی قوموں کے خیالات وجذبات کو بھی بتا اور سمجھا گئے! اور فارسی کے یہاں گھر کرنے اور ہندی سے بہناپا ہو جانے کی ایک نادر و مزید تاریخ لکھکر چھوڑ گئے!

خسرو۔ پائے تخت کے شاعر شہزادوں کے اُستاد اور شاہوں کے رفیق وہمدم تھے انکی زبان گویا سلطنت کی زبان تھی۔ یہ خالق باری حاکم و محکوم دونوں کے دل کا آئینہ بنی اور اسکے لفظ لفظ سے اس وقت کی حکومت اور رعایا کے اصلی حالات کا مُرقع پیش نظر ہو گیا!

فارسی ہندی عشق!

جس ضرورت نے خالق باری کو پیدا کیا۔ وہ ضرورت روز بروز بڑھتی اور پوری ہوتی رہی۔ شاہی اشارہ بھی اسے مدد دے رہا اور ہندو مسلم اتحاد بڑھ رہا تھا کہ خلجیوں[1] کا دربار چمکا اور اب ایرانی علماء کے ساتھ ہندی فضلا بھی زینتِ مجلس ہونے لگے۔ کتھا کس ایک فاضل و متبحر پنڈت و منجم اسی دور کا آفتاب علم و دانش مانا گیا اور مغربی و مشرقی علوم و زبان کی شعاعیں ملیں اور اس زمین کو منور کرنے لگیں علاؤالدین اس آسمان کا وہ شاہ خاور ہے جس کی بدولت اتحاد کی روشنی اور پھیلی۔ گجرات کی زہرہ مہارانی کملا دیوی[2] نے اس کی منزل کو منور کیا اور بادشاہ اس پر دین و دولت نثار کر بیٹھا۔ قلعۂ سلطانی راج گڑھ بنا اور محل کے اندر اور باہر

---

[1] سنہ ٦٨٩ھ ١٢٩٠ء

[2] کملا دیوی راجہ کرن رائے کی رانی۔ دیکھو حالات فتح گجرات در سنہ ٧٠٦ھ ١٣٠٦ء

فارسی، ہندی، جھنڈا ساتھ اڑنے اور لہرانے لگا۔!

اس نشان اخلاص کو سلطنت کے دو شریکوں خضر خاں[1] و دیول دیوی نے اور بلند کر دیا۔ ان کے آپس کی مہر و الفت نے قصۂ نل دمن کو افسانہ بنا دیا۔ شعرائے اسکی یاد تازہ رکھی اور فارسی ہندی عشق کا چرچا مدتوں زبانوں پر رہا!!

فارسی ہندی گورنمنٹ

یہی وہ رکھی بندھن تھا جس نے دو مختلف قوموں کو ایک رشتہ میں باندھکر حاکم و محکوم کی مغائرت اور بھڑک دور کر دی اور فارسی کی سلطنت میں ہندی بھی شریک ہو گئی! اس دلی اتحاد نے آخر وہ زور پکڑا کہ قومی اختلاف مٹا اور قطب الدین (مبارک شاہ) نے ایک ہندی نژاد خادم کو خسرو کا خطاب دیکر اپنے تخت پر جگہ دیدی! اسکی نیابت وزارت میں ہندیوں نے اپنے ملکی کاموں کا بار اٹھایا اور اسکی بادشاہت میں تو فارسی ہندی پہلو بہ پہلو نظر آنے لگی۔!!

یہ تھا آج سے نو سو برس قبل کا اتحاد اور یہ تھی وہ ہندوستانی سلف گورنمنٹ جسے ہماری تاریخ داں جماعت اب تک مزے لے لیکر یاد کر رہی ہے!

---

[1] خضر خاں (پسر علاؤ الدین) دیول دیوی (دختر کملا دیوی) کے عشق و محبت کے قصے زمانہ میں یادگار رہیں گے۔ ہندی و فارسی شعراء نے اس پر نظمیں لکھیں۔ اور میر خسرو نے تو اپنی ایک مثنوی ہی ان کے نام پر معنون کی۔ دیول دیوی واقعی مہر و وفا کی دیوی تھی جو خضر خاں کے ساتھ قید خانہ میں شہید ہو کر ہندی کیرکٹر کا نام زندہ کر گئی۔ اسی واقعہ کی طرف خسرو نے اشارہ کیا ہے۔

بجائے آب ازاں گل خوں کشیدند   نگہ کن تا گلابش چوں کشیدند

کچھ تازہ تعلقات

یہ اتحاد روز بروز ترقی کر رہا اور ادب و انشا کا مذاق بھی ساتھ ساتھ بڑھ رہا تھا کہ شاہان تغلق اپنا علم لئے نکلے یہ سیف و قلم دونوں کے بادشاہ تھے ان کو مدتوں چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ لیکن ادب و لٹریچر کا چسکا وہ بدبلا ہے کہ تلوار کی جھنکاریں بھی اسی کی خوش آیند آواز کانوں میں آیا کرتی ہے! محمد تغلق کی محفل بھی یوں ہی جمی اور جب اس نے ذرا کمر سیدھی کی شعر و شاعری کلفت دور کرنے سامنے آ بیٹھی۔ یہ خود شاعر ادیب اور فضلائے روزگار میں سے تھا۔ اس کا دربار شعراسے گھرا رہتا اور عربی و فارسی ادیبوں کے ساتھ کوئی بھی دامن دولت سے لپٹے رہتے اور انہیں مالا مال کرتا رہتا[1]! یہاں کی بھاکھا کے علم اور اس کیساتھ[2] شاہی دلچسپی و محبت کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ جب وہ ایک مہم کے عزم پر فرخ آباد کے ایک قصبہ کھور میں اترا اور وہاں اسے آرام ملا تو خوش ہو کر اس قصبہ کو سرگ[3] دواری (دروازۂ جنت) کا لقب بخشتا اور اس طرح رعایا کا دل شاد کر کے اتحاد زبان کا سبق دیتا ہے!

سلطان فیروز ادب و شاعری کو ترقی دینے اور غیر زبانوں میں رسم و راہ پیدا کر دینے میں ہارون و مامون وقت تھا یہ بھی محمود (تغلق) کیطرح فاضل[4] اور

---

[1] دیکھو مسالک الابصار فی ممالک الامصار از ابو العباس [2] دیکھو سفرنامہ ابن بطوطہ محمد تغلق نے شمس الدین اندکانی کو اس کے ایک فارسی قصیدہ کے صلہ میں ۲،۷ لاکھ دینار عطا کیا [3] سرگ۔ بہشت اور دواری، دروازہ [4] فیروز نے اپنا تزک (آٹو بائگرفی) خود لکھا ضیاء الدین برنی و سراج عفیف کے سے مورخین اسی کے دربار سے وابستہ تھے۔

دلدادہ علوم و فنون تھا۔ نگر کوٹ سے سنسکرت و ہندی (بھاشا) کی ہزار ہا کتابیں
دلی ساتھ لایا انہیں سُنا اور پنڈتوں اور علماء کو جمع کر کے ان میں سے اکثر کے
ترجمے[1] کا حکم دیا۔ علماء کو یہاں کی زبان بتائی اور پنڈتوں کو فارسی سکھائی اور
یوں اُن دونوں میں ربط ڈالا! اور یہ اسی مبارک عہد کا نیک شگون تھا کہ عام
لوگوں سے گذر کر سب علمائے ہند کا لب و لہجہ بھی بدلا اور انکی زبان میں وہ فرق
ہو چلا جس کا نتیجہ اس کے کچھ ہی دنوں بعد ایک نئی صورت میں ظاہر ہوا۔

یہ نئی صورت آپکی اس اردو کا وہ پتلا تھی جو صدیوں کی مشق و کاریگری کے
بعد آخر ایک دن دنیا کے سامنے کھڑا ہو گیا!

فارسی تعلیم اور ہندی عروج

ان علمی چرچوں اور قوموں اور زبانوں کے ارتباط و اختلاط کو ایک
صدی گزر چکی اور دماغوں میں یکسوئی پیدا ہو چلی تھی کہ لودھیوں کا دربار

---

[1] سلوتر (سالی ہوترا) کی سنیاد تصنیف اسکے حکم سے (فارسی میں) ترجمہ ہو کر قرۃ الملک بنی۔ علم حیوانات پر یہی وہ نایاب کتاب ہے جسے بحکم شاہ جہاں عبداللہ خاں فیروز جنگ نے اضافوں اور حاشیوں کے ساتھ دوبارہ ترتیب دیا۔ دلائل فیروز (ر) سنسکرت سے ترجمہ تاریخ فیروز (از برنی) اور عین الملکی بھی کتابیں اسی کے حکم سے تصنیف ہوئیں۔!

نوٹ:- مورخین کہتے ہیں کہ محمد تغلق کے دربار میں اکثر شعرائے فارسی گو کے علاوہ ہندی شعراء بھی بکثرت تھے۔ سلطان فیروز کے عہد میں اور ترقی ہوئی یہ فیروز ہی تھا جس نے ہندو یادگار و نیز توقیر کی اسوکھ کے میناروں اور ستونوں کو جو ضلع خضر آباد و میرٹھ میں ویران و تباہ کس مپرسی پڑے تھے بغیر ریل کی کمک اور موجودہ انجنیری کی مدد کے صحیح و سالم اپنے دارالسلطنت تک لے آیا اور یوں رعایا کا دل شاد کیا! آتا سی گھڑیال (نام پر غور کرو) بھی اسی کی ایجاد ہے جسے موجودہ زبان میں گھنٹہ گھر کہتے ہیں اور تاریخ سے نابلدی کی بدولت اسے ہم یورپین ایجاد سمجھتے ہیں (دیکھو خلاصۃ التواریخ از سجن رائے کھتری۔

چمکا۔ یہ محفل اگلی صحبتوں کی یادگار اور پرانی وضع وطرح میں گذشتہ مجلس سے زیادہ پختہ و دیر پا تھی۔ بہلول کے بعد سکندر نے اس انجمن کو رونق دی یہ واقعی نصیبے کا بھی سکندر تھا۔ اور اس کا زمانہ دلوں کی فتح اور مغائرت قومی کی شکست کے لئے صفحۂ روزگار پر ہمیشہ نمایاں رہے گا وہ بھی اپنے پیش رُوں کی طرح ادب و انشاء کا عاشق اور شاعری پر فریفتہ تھا۔ گلرخ[1] تخلص کرتا اور قصائد و غزلیات کا شگفتہ بنتا اپنے ادب کے ساتھ یہاں کے لٹریچر کی اشاعت میں وہ محمد و فیروز (تغلق) سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اگرچہ ابیدک کی سی طبی تصنیف کو اسی نے فارسی کا خلعت بخش کر طب سکندری خطاب دیا! علم کے شوق کی انتہا یہ تھی کہ سیف و قلم کو اس نے ایک ہاتھ میں پکڑا دیا۔ فرمان ہوا کہ ہمارے فوجی ملازم ناخواندہ نہ رہنے پائیں اس حکم نے تعلیم کو عام اور جاہلوں کو خواندہ بنا کر ملک بھر میں شائستگی پھیلادی!

اس سکندر کا یہی ایک آب حیوان نہ تھا بلکہ ملک و قوم کی سرسبزی کیلئے اور بھی بہت سے چشمے اس نے جاری کئے انتظام ملکی کے لئے کالے گورے کا امتیاز اسی نے اٹھایا اور صرف علم کو معیار قرار دیکر حاکم و محکوم کو ایک ہی صف میں اسی نے کھڑا کر دیا اس حکم پر ملک بھر میں چراغاں ہوئے اور تحصیل علم کے لئے خلقت ٹوٹی۔ اہل ہند بشوق آگے بڑھے اور سلطنت کی زبان سیکھ کر دولت کے شیر بنے اور بقول مسٹر بلوک مین[2] بہت جلد وہ اپنے استادوں پر سبقت لے گئے

---

[1] سلطان کی ایک مشہور غزل کا مقطع ہے ؎

گلرخ چہ کند جوہر دندانِ ترا وصف   ہمچو در سیراب سخن در دہنش

[2] دیکھو کلکتہ ریویو۔ مسلم تاریخ کا ایک باب از پروفیسر بلوک مین۔

بہت کم مدت میں نئے خیالات اور نئے مذاق عام ہو گئے اور کوئی شاعر نکبر سعدیؒ حافظؒ کا گھر گھر درس و سبق دینے لگے۔ پنڈت ڈونگر ملؒ اسی سکندری عہد کے وہ ادیب ہیں جن کی شاعری اور زبان دانی نے مسلمانوں کے کان بھی کھڑے کر دیئے اور وہ اساتذہ میں شمار کئے گئے۔

اُردُو

جبکہ حاکم و محکوم کا امتیاز یوں اُٹھ رہا۔ اور تعلیم اس طرح عام ہو رہی ہو تو پھر سلطنت و رعایا کی زبان بھی کبتک ایک نہ ہو جاتی ضرور ہوتی اور فارسی ہی ملکی زبان قرار پاتی۔ لیکن یہ سلاطین اب ہندی ہو چکے اور یہیں کی خاک کو اکسیر و کیمیا اور یہیں کے پتھروں کو اپنا پارس سمجھ رہے تھے وہ علاوہ اور ملکی اثرات سے متاثر ہونے کے یہاں کی ریت و رسم تک اُٹھا چکے تھے۔ محفل و مجلس میں گوٹا ہار کے ساتھ پان کے بیڑے تک بے تکلف آتے اور صرف مُنہ چھوانے نہیں بلکہ مزا لینے اور مزہ دینے کی خاطر چنگیر چنگیروں پر پیش کش ہوتے رہتے۔ اور تو اور یہاں تک کہ سلطان سکندر تک اس اثر سے بچ نہ سکا اور ملکی رنگ اس پر ایسا چڑھا کہ قومی شعار کا لباس اتار پھینکا۔ پشتینی واڑھی رسم ہند کے آگے نذر کر بیٹھا اور محتسب وقت

۱؎ پنڈت کا یہ ایک شعر اکثر تاریخوں میں نظر آتا ہے۔

دلِ خوں نشد ئے چشم تو خنجر نہ شدے گر ۔ رہ گم نہ شدے زلف تو ابتر نشدے گر

۲؎ اختیار کرنا ۳؎ دیکھو تاریخ فرشتہ وغیرہ۔ ۱۲

مولوی عبدالوہاب[1] کے طعنوں سے بھی ذرا نہ ڈرا۔

جن سلاطین کے یہ بے تکلفانہ رنگ ہوں اور جنہوں نے ہند کو گھر بنایا اور اسکی پیداوار پر اپنی ہستی کا مدار سمجھا ہو اُن سے کیونکر امید کیجا سکتی تھی کہ اس زمین کی بہترین پیداوار (زبان) کا روندنا دیکھ سکیں گے انہوں نے اسے بھی نعمت سمجھا اور اس نئی تعلیم کے چشمہ سے اُسے تازہ اور ہرا رکھنا چاہا۔ یہاں کے کویئوں کو اپنے شعرا کی طرح مانا اور انہیں بھی اپنا جانا اور اس طرح بھاشا پامالی سے بچکر پھولنے پھلنے لگی۔

دوسری طرف رعایا تھی جس کے لئے فارسی نئی اور غیر نہ تھی وہ جانتی تھی کہ ہماری مذہبی زبان (سنسکرت) اور سلطنت کی زبان کا ایک ہی خاندان ہے اور مرحوم سنسکرت کی اب یہی ایک یادگار باقی ہے وہ فارسی کی حکومت اور سیادت و وسعت[2] سے بھی واقف اور اپنی بھاشا کے مزاج و ماہیت[3] سے بھی آگاہ تھی۔

---

[1] دیکھو داؤدی مکالمہ عبدالوہاب و سلطان سکندر۔ [2] فارسی کی حکومت تو ظاہر ہے کہ اسوقت ماوراالنہر سے لیکر ترکستان تک اور پھر ہرات سے لیکر بنگالہ اور ہمالہ سے دکھن تک اسی کے زیرنگیں تھا سیادت کا یہ حال کہ عربی اخلاق و مذہب کے ساتھ ہندوؤں کا پرانا اخلاق و فلسفہ اور انکے علوم بھی اس زبان میں آچکے تھے اور وسعت کی یہ کیفیت کہ نظم و نثر میں دنیا کی تاریخ و حکایات کا ذخیرہ موجود تھا ایک شاہنامہ ہی وہ مخزن ہے جسکی سی جامع کوئی تصنیف آج یورپ بھی پیش نہیں کرسکتا۔ نوٹ:- ترقی علوم کا شوق اس عہد میں اتنا بڑھا کہ سلطانوں اور وزیروں سے گزر کر امیروں تک پہنچا مسند علیخاں اسی عہد کا ایک امیر جسکی ساری عمر اور کل دولت اشاعت علوم و فنون ہی میں صرف ہوئی اسکا دستور تھا کہ جب اس کے نوکروں میں سے کوئی مرجاتا تو اس کا وظیفہ اسکے وارث پر جاری ہوتا اور وارث نہونے پر متوفی کی بی بی کے لے پالک کو اس شرط پر دیا جاتا کہ یہ اس قسم کی تعلیم و تربیت پر صرف ہو۔ اسی کوشش میں فنون سپہ گری بھی داخل تھے یہ تھی اس زمانہ کی تعلیمی فیاضی (دیکھو واقعات مشتاقی) [3] دوسری زبانوں سے فائدہ اٹھالینا بھاشا کی فطرت میں داخل ہے اسکی ایسی طبیعت روکی نہیں جاسکتی تھی۔

اس لیئے بشوق آگے بڑھی اور فارسی کو سر اور آنکھوں پر جگہ دینے لگی دونوں جانب
کے خلوص و کشش نئے زور کیا اور فارسی و بھاشا آخر ساتھ ساتھ چلنے اور بڑھنے لگی۔

اس دوا دوی میں بھاشا فارسی پر سبقت لے گئی اور اپنے اصول و ساخت[۱]
توڑے اور بدلے بغیر چل نکلی۔ اپنے ساتھی (فارسی) کی سرکار سے رفتہ رفتہ اس نے
وہ کل لوازمات اور ضروریات زندگی کے وہ ساز و سامان حاصل کر لیئے کہ اسکی
دوکان کا خریدار و گاہک اور طرف کا محتاج نہ رہا۔ اس کا بازار عام و وسیع ہوکر گرم
ہوا اور آخر وہ اردو بنا جسے دیکھکر ترکی ذنگ اور مغل شرمندہ رہ گئے۔

یہ سکندر کی خوش نیبی تھی کہ ہماری بھاشا کی ایسی ترقی صرف اسکی ذات
سے منسوب[۲] ہوگئی۔ اور یہ امیر تیمور کی خوش نصیبی تھی کہ آپ کی اردو اس کے نام کے ساتھ
وابستہ[۳] سمجھی گئی اور نہ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا یہ صدی دو صدی کی حکایت نہیں
بلکہ پورے آٹھ سو برس کا دلچسپ قصہ و فسانہ ہے۔ اور ماہرین زبان (فلولوجسٹ) جانتے
ہیں کہ شجر زبان کسی بھان متی کا درخت نہیں ہوتا بلکہ وہ نیچر و قدرت کی ایسی عظیم الشان
نشانی ہے جو دنیا کے سب سے بڑے اصول یعنی قاعدہ ایولیوشن (ارتقاء) کے
موافق بہت آہستہ آہستہ ترقی پاکر ایک وقت خاص میں سایہ دار و پائدار ہوتا ہے اور
اگر آپ نظر کریں گے تو اس ترقی یافتہ بھاشا، یعنی اپنی اردو کو بھی اسی قاعدہ کے
ماتحت پاکر اسکی عمر اور اسکی بزرگی و استحکام کو بآسانی سمجھ سکیں گے!!

۱ے بھاشا صرف و نحو جس پر کسی زبان کا مدار ہوتا ہے۔ بدستور قائم رہی ۲ے دیکھو گارسی
دتاسی (فرینچ) کا تذکرۂ شعرائے اردو (دی ہندوستانی لٹریچر)
۳ے دیکھو انسائیکلو پیڈیا۔ ذکر ہندوستانی زبان۔ ۱۲

مغل اور اردو

مغل! یہ وہی مغل ہیں جو اس باغ ہند کے آخری باغبان کہلائے اور جنکی ریاضتوں نے اسے گلزار بنایا اور تین سو برس کی عرق ریزیوں کے بعد جن کے اقبال کی بہار پلاسی کے میدان میں آخر خزاں ہو گئی!

امیر تیمور اس گھر کا وہ پہلا صاحب قران[1] ہے جس کے قوی بازوؤں نے دو ملکوں کے ستاروں کو کھینچ کر پھر ملا دیا۔ خاندان تغلق کے سرنگوں ہونے پر اس گیتی ستان کے قدم ادہر[2] آئے اور اسکی پولاد تن و پنبہ پوش[3] قوم اس نرم و گرم زمین پر ایکسال

---

۱ امیر تیمور کا لقب صاحب قران اول تھا (شاہ جہاں صاحب قران ثانی کہا گیا) اور اسی کی وجہ ترک پھر ادھر آئے۔
۲ بشیر ۳ ترکوں کی تصویر سے سخت سرانے، بوغا سخت کوش ٭ برہمہ پولاد تن و پنبہ پوش
روئے کو آتش کلہ از پشم میش ٭ آتش سوزاں شدہ با پشم خویش۔ (قران السعدین خسرو)

نوٹ:- اردو بے شک (جغری) ترکی ہے لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ امیر تیمور ہی کی بدولت یہ لفظ یہاں پہنچا قرین قیاس نہیں۔ یہاں ترکی خاندان حکمراں اور ترکی پھیلے ہوئے اور ترکی اور فارسی کے سینکڑوں الفاظ زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ تیمور تو برس سوا برس سے زیادہ ہند میں رہا ہی نہیں اور وہ بھی کہیں سیلانی مقیم نہیں ہوا بلکہ فتوحات میں مشغول اور ہمیشہ سفر ہی میں رہا۔ اسے یا اسکے لشکر کو اختلاط زبان سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا۔ قرائن کہتے ہیں کہ یہ لفظ بہت پہلے سے یہاں مروج تھا۔ انسائیکلو پیڈیا نے ایک قصہ کو (میر امن صاحب باغ و بہار) کی سند سے اردو کو صاحب قران کا تحفہ سمجھ لیا مگر چہار درویش ہی کب مستند ہے۔

یہی حال سکندر لودی کا ہے کہ تعلیم کو عام کر دینے کی وجہ سے وہ ایک مخلوط زبان (اردو) کا بانی سمجھ لیا گیا۔ اسمیں شک نہیں کہ اسکی جہت سے فارسی یہاں عام ہو گئی اور بھاشا کو اس سے بڑی مدد ملی لیکن جیسا کہ دکھایا گیا ہے بھاشا اپنا ظاہری لباس بدلنے کے لئے عربوں کے وقت اور چھ سات سو برس سے تیار ہو رہی اور ایک مخلوط زبان اردو آپ سے آپ بن رہی تھی حاکم و محکوم کا شیر و شکر ہو جانا بھی آج کی نہیں بہت عرصہ کی بات ہے۔ اسے صرف اکبر سے منسوب کر دینا خوش اعتقادی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

جمی اور کھڑی رہی۔ اس کا اردو ولی کو زیر زبر کرتا، ہر دوار پر چڑھتا اترتا اور پنجاب کو منقلب کرتا ہوا گھر لوٹا تھا۔

ایسے طوفان میں قومیں اور زبانیں ملتی نہیں بلکہ بکھرتی ہیں اور اگر لودی نہ سنبھالتے تو یہ ہلچل ہمارے شیرازہ کو نہ معلوم کب تک پراگندہ رکھتی۔ سکندر لودی کا احسان کہ ترقی ارتباط و اتحاد کی راہیں اس نے پھر نکال دیں مگر افسوس کہ اسکی زندگی کی طرح اسکی (ترقی) عمر بھی محدود رہی! ابراہیم اس کا خلف الرشید نہ تھا اور معاملات میں پھنسا اور آخر پانی پت کے (تاریخی) میدان میں سلطنت و جان ہار کر پردۂ خاک میں چھپ گیا۔ بابر کی جیت اور مغلوں کی نام آوری شروع ہوئی اور ترکوں کا آفتاب درخشاں ہونے لگا۔

بابر تلوار ہی کا دھنی نہیں بلکہ قلم و زبان کا بھی دھنی تھا۔ ادب و شاعری اسکی فطرت میں تھی۔ جب اُسے دیس نکالا ہوا اور تاشقند پہنچا تو وہاں شکار و شاعری ہی اس کے دو بہترین مصاحب تھے۔ کوہ و بیاباں میں تیر و تفنگ چلاتا اور آبِ روان کے کنارے بیٹھ کر غزلوں سے جی بہلاتا اور عالمِ سرور میں کہتا ہے

نوروز و نوبہار و مے و دلربا خوش است[۱] بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ایسی پر جوش طبیعت پر اس چمن کی سیر ایک اور تازیانہ تھی۔ وہ سودا یہاں بڑھا اور اپنے پرانے مشغلہ کو ہمیشہ تازہ کرتا رہا۔

سکندر (لودی) کے بعد اور نو سو بتیس ۳۲ ہجری اور پندرہ[۲] سو چھبیس ۲۶ عیسوی کے یادگار سن میں ہمارے ملک کی زبان کیا تھی؟ اسے ہم فردوس[۳] مکانی کی زبان سے

۱؎ دیکھو واقعات بابری از خانخاناں ۲؎ فتح پانی پت و شکست ابراہیم لودی ۳؎ فردوس مکانی بابر کا لقب تھا

سناتے ہیں ایک مقام پر جب اس کے ایک نامی سردار نے شکست کھائی اور یہ خبر اس نے پائی تو اس کا ذکر اپنے تزک میں کر کے لکھتا ہے کہ سردار کی یہ پسپائی قابل عفو ہے۔ غیر زمین غیر کفو ہی نہیں بلکہ غیر زبان سے مقابلہ۔ نہ ہم یہاں کے بول سمجھ سکتے اور نہ وہ ہماری زبان جانتے ہیں![1] پھر ایک جگہ آگرہ کے ذکر پر کہتا ہے کہ میرے آدمیوں کے لئے یہاں کی زبان نئی ہے اور اس سے وہ بھڑک رہے ہیں۔

یہ دو شہادتیں اتنا سمجھ لینے کے لئے کافی ہیں کہ اس وقت یہاں وہ زبان دائر و سائر تھی جو ان ترکوں کے لئے غیر تھی جنکی روزمرہ فارسی ہو رہی تھی۔

غور کرنا چاہیے کہ غیر ملکیوں کو یہاں جمے ہوئے تو سو برس ہو چکے۔ وہ مالک الملک بنے ہوئے تھے قانون اور ہر طرح کا اختیار ان کے ہاتھوں میں تھا وہ جب چاہتے زبان کی کایا پلٹ دیتے مگر نہیں وہ اس زمین کی آب و ہوا سے آشنا ہو چکے اور خوب جانتے تھے کہ خلاف فطرت کام کا نام ظلم اور زبردستوں کی گردن کستی ہے انہوں نے یہاں کی زبان کبھی نہیں کھینچی بلکہ اُسے چاہتے سیکھتے اور یوں رعایا کا دل ہاتھ میں لئے رہتے تھے؟

بابر اس معاملہ میں اپنے پیشروؤں کا مقلد اور خلف الصدق تھا وہ خود ادیب و شاعر تھا اور اسی وجہ سے دوسری زبانوں کی قدر کرتا اور ان کا ادب ملحوظ رکھتا تھا۔ یہاں آکر اپنی رعایا کی زبان اس نے سیکھی اور اپنے روزمرہ میں داخل کی اس کے تزک کو پڑھو کس بے تکلفی سے ہندی و ترکی کا جوڑ ملاتا اور یہ فصاحت اسے

---

[1] دیکھو فتح قلعہ بلوٹ کا حال اور دولت خاں کا بابر پاس آنا جب ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے تو بیچ میں ترجمان کھڑا کیا جاتا ہے جبکہ مسلمانوں کا حال یہ تھا تو یہاں کی اور قومیں تو فارسی سے اور دور ہونگی!

ادا کر جاتا ہے !

وہ ہمہ گیر شاعر بادشاہ اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ پیاری زبان کو خلعت نظم بھی بخشتا ہے اس کی رنگین طبیعت نے ایک مرتبہ اپنے تخیلات و جذبات کے پتلے کو ترکی خرقہ اور ہندی جامہ ساتھ پہنایا اور شوخیوں کے ساتھ اُسے محفل میں یوں جلوہ دیا[۱]

مجکا نہوا کچ ہوس مانک[۲] و موتی　　　　فقر اہلیغہ[۳] بس بولغوسید رپانی و روتی

(مجکو) بادشاہ کہتا ہے کہ مجھے یاقوت اور موتی درکار نہیں فقیر مست چوں ایک گردہ نان اور ایک کوزہ آب بس ہے۔ آپ کی اردو کا یہ پہلا شعر جس وقت ظل اللہ کے منھ سے نکلا ہوگا تو نہ معلوم محفل کا کیا رنگ اور درباریوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کتنی واہ واہ ہوئی ہوگی اور پُر مذاق وزرائے دولت نے موتیوں کے کتنے طبق وارے ہونگے اور اسکی رعایا اپنے بادشاہ کی زبان سے اپنی بولی سن کر کس طرح خود کو

---

۱ بابر کا یہ اردو شعر اسکے ایک ترکی رسالہٗ عروض میں (جو سرکار رامپور کے کتبخانہ میں محفوظ ہے) خود اس کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے جس پر خانخاناں سے لیکر اکبر (شاہجہان تک کی مہریں اور دستخط ہیں۔ بحر کا نام ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف اور تقطیع یہ ہے :۔

مجکان	ہوا کچ ہ	وس مان	ک موتی
مفعول	مفاعیل	مفاعیل	فعول
فقر ہل	غ بس بلغو	سدر پان	درو تی
مفعول	مفاعیل	مفاعیل	قعول

مکرمی جناب حافظ احمد علی خانصاحب (مہتمم کتب خانہ) کا ممنون ہوں کہ انکی توجہ سے اسکی زیارت کرسکا رسالۂ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۹۱۰ء کے ایک نمبر میں مخدومی ڈاکٹر راس (حال سکریٹری اورنٹیل اکیڈیمی لندن) نے بھی اس شعر کا فوٹو لیکر نوٹس کے ساتھ اسے درج کیا تھا۔ ہماری نظر جہاں تک ہے بابر سے قبل کسی نے اردو میں نظم کی ہمت و جرات نہیں کی۔ اسلئے جب تک اسکی تردید نہو فردوس مکاں ہی اسکے موجد اور اس صنف کے باوا آدم مانے جائیں گے !

نثار کرتی ہو گی!

یہاں پر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ مانگ اور موتی ہندی ہے۔ غریب ترکوں کے یہاں موتیوں کا یہ مینہ کہاں برستا تھا کہ ترکوں کا وہ سنگار ہو سکتا اور نکی تخئیل میں وہ مدد دیتا!

یہ تو آپ کے اقبال کے وقت کی سچی کہانی ہے کہ بال بال میں پرو ئے جانے کے بعد ڈھیر کے ڈھیر موتی بچ رہے تو جوتیوں میں ٹانک کر پہنے گئے ترکی بادشاہ کے الفاظ ہی نہیں بلکہ چار برس[1] کے اندر اس کی تخئیل بھی دیکھئے۔ ہندی ہو گئی! دوسرے یہ کہ وہ پروشیوں کا بادشاہ اور ہنس (جرمن) کا سرا زبہ تھا کہ فرعونیت دکھاتا اور اوتار بنتا۔ بلکہ وہ ہندی بادشاہ تھا اس لئے شاہی سے زیادہ فقیری بھائی اور اس روپ میں اپنا احوال کہہ سنایا اور یہی وہ اسلامی و ہندی اصلی شاہی کیر کٹر ہے جسے فردوس مکانی کچھ عجب شان سے دکھا گیا!!

ہمایوں جی اور اُردُو

جو زبان بادشاہ کے منھ لگ چکی ہو اس کا سلطنت کے دودھ سے پلنا کیا بڑی بات تھی؟ ایسا ہی ہوتا۔ مگر بابر کی عمر نے وفا نہ کی اور ہمایوں[2] برگشتہ

---

[1] بابر یہاں آنے کے بعد صرف چار برس زندہ رہا۔ [2] واقعی ہمایوں کے سے سخن رس کو اگر موقع اطمینان ملتا تو نہ معلوم اتحاد و ترقی زبان کے لئے کیا کر جاتا جس نے کامران مرزا کو اسکی ایک غزل سے

کامران تا کہ جہاں راست بقا — خسرو دہر ہمایوں بادا

کے صلہ میں حصار فیروز بخش دیا ہو وہ یہاں کے کوئی او شعرا کو کیا کچھ نہ دے جاتا۔ یہ خود بھی شاعر تھا فلسفیانہ و اخلاقی رباعیاں اسکی دیکھنے کے قابل ہیں۔ ریاضی داں بھی بڑا تھا۔ دلی میں صدخانہ اس کا مشہور تھا۔ اور اسی کی سیڑھیوں پر سے اگر کر مرا۔ "از بام افتاد" تاریخ موت ہے۔

تقدیر رہا اور شرفوں کے ساتھ یہ شرف بھی اکبر ہی کے لیئے اٹھا رکھا گیا تھا جب وہ تخت نشین ہو کر بیٹھا تو ادھر بھی متوجہ ہوا۔ بکرماجیت کا وقت یاد آیا اور اپنے دربار کو بھی نورتن[1] سے سجایا چار ایوان[2] کھڑا کیا گیا اور وہاں حکمت و ادب کا درس دیا گیا۔

اس مدرسہ میں چھٹی ملتی تو فارسی ہندی کتاب کھلتی اور دونوں زبانوں کا تال میل شروع ہو جاتا۔ کبھی مہابھارت کا میدان نقیب خاں کے سپرد ہوتا اور اسے رزم نامہ کا خطاب ملتا اور کبھی رامائن کی کتھا کہی جاتی اور کرشن گنگادھر اور مہیش کے ساتھ ملائے۔ بدایون کی زبان بھی صاف کی جاتی۔ امیر حمزہ کی داستان ختم ہوتی اور ہری بنس کا قصہ چھڑتا اور ملا شیری۔ شری کرشن جی کا نام جپتا آج سنگھاسن بتیسی کی پتلیاں ناچتیں، حکمت کا راگ چھڑتیں اور خرد افزا سمجھی جاتیں۔ تو کل کلیلہ و دمنہ کے طلسمی حیوان گویا ہوتے۔ چٹکلے، لطیفے کہتے اور عیار دانش بنتے کبھی لیلیٰ مجنوں (عربی) اور شیریں خسرو (فارسی) بدیسی سمجھ کر محفل سے اٹھائے جاتے اور انکی جگہ

---

[1] نورتن۔ نو تو ۹۔ رتن جواہر آنکھوں کی پتلی بکرماجیت نے بھی ایسے نو جواہر فضلا و حکما و شعراء جمع کیے تھے

[2] فتحپور سیکری میں اکبر نے چار ایوان اور ایک محل بنوایا تھا جس میں علماء و فضلا جمع ہو کر علمی مباحثہ میں شریک رہتے اور بادشاہ اس مجلس کا صدر ہوتا۔

نوٹ ؛۔ بابر کو جوانی سے بن دیکھے ہندوستان کا عشق، یہاں کی خاک سے الفت اور یہاں کی خاص چیزوں سے شغف تھا۔ کابل میں بیٹھا ہوا ہمارے آموں اور پانوں کو یاد کرتا ہے اور جب ایک ذریعے سے تحفتہً یہ چیزیں ہاتھ لگتی ہیں تو خوش ہوتا اور شکر بجالاتا اور اس سے نیک شگون لے کر ہند کی طرف بڑھتا ہے۔ دیکھو تزک بابری۔ بابر خود فاضل اور فضلا کا رتبہ داں اور وہ خوش شاعر اور شعرا کا قدرداں تھا۔ عروض میں ایک رسالہ اور ایک مثنوی مبین اسکی یادگاروں میں سے ہے وہ خوش نویس بھی تھا اور ایک رسم الخط ایسا ایجاد کر گیا کہ خط بابری اس کا نام ہی پڑ گیا۔

سدیشٹی نل دمن لیتے۔ زلیخا کی ملک رانی دروپدی کو ملتی۔ اور زبیدہ کی حرم سرا سیتا جی کے نیگ لگتی۔ فیضی مودب ہوکر لیلاوتی کا حساب پیش کرتا تو نکمل خاں ورانو ہوکر تاجک کی شکل و ہیئت بتاتا۔ سرہندی (حاجی ابراہیم) آداب بجالاکر اتھر ویدا کی حکمت سناتا اور خانخانان (عبدالرحیم) دعائیں دیکر جوتش سے نیک لگن اور سُبھ گھڑی بناتا۔ غرض یہ چرچے اور یہ قصے مہینوں نہیں برسوں رہے اور محفل اور دربار شاہی سے نکل کر ہزاروں اور عوام کے کانوں تک پہنچے ان ہی نسخوں نے رفتہ رفتہ خیالات پلٹے اور دو قوموں کے سروں کو اکٹھا انکی زبانوں کو ایک اور اُن کے تخیلات کو یکسو کر دیا!

بادشاہ خوش اور رعیت پھولوں نہیں سماتی۔ ظل اللہ کو مہابلیؔ پکارتی اور اس کے درشن کو مکت (نجات) جانتی۔ مہابلی جی سونے روپے میں تلتے۔ بلا (طلا) دان کرتے، برہمنوں کی گود بھرتے اور انکی دعائیں لیتے! شمع کافوری بجھتی۔ اکاس دیا جلتا اور مصلا آتش سے بدلتا نوروز کے رنگ میں ہولی کھلتی اور شب برات دوالی گلے ملتی!۔

جہاں رسم ورواج کی پگڑیاں یوں بدلیں وہاں زبانوں کو ملتے اور بدلتے کتنی دیر! بھاشا سے اخلاص اتنا بڑھا کہ فارسی کرنگ (اسپ) کا کاف کھٹکا اور اور بدی کی علامت سمجھ کر گرایا گیا۔ ایسی بدی شاہی اصطبل کو آخور کرتی اس لئے کرنگ، سرنگ بنا کر کھڑا کیا گیا الہ آباد گنگا جمنا کے سنگم پر تھا۔ ماگھ میلہ میں الیشو کا نام وہاں لیا جاتا تھا، اس مناسبت سے وہ الہ باس پکارا اور یوں اردو بنایا گیا!

لہ مہابلی۔ بزرگ و برتر ٢ے بھاشا میں حرف کاف بدی کی علامت ہے۔

ازاں قبیل قوم اور زبان کی اصلاح و ترقی کے لئے ایسے کھیل ہر گھڑی کھیلے اور فارسی ہندی کے جوڑ دان تپلے بیٹھے بیٹھے کھڑے کئے جاتے۔

بادشاہ کی ایسی غربا نوازی اور رعایا پروری نے موتمن الدولہ عمدۃ الملک راجہ ٹوڈرمل کی وفاداری کو اور چمکایا۔ ان کے حساب میں شاہی زبان کی پوجا کا یہی وقت نکلا۔ تمام قلمرو میں فارسی کے آداب و خیال کا فرمان و پروانہ گیا۔ تعلیم عام[1] ہوئی۔ شودر[2] تک دوات پوجا کرنے لگے اور فارسی ہندی کی گنگا جمنی مسندیں بچھنے اور سکندر (لودی) کے وقت کی برکت یاد آنے لگی۔

بادشاہ اس ایک جہتی کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا، باغ باغ ہوتا اور اپنی تدبیروں پر ناز کرتا۔ اسی دوران میں اگلی پچھلی باتوں پر نظر کرکے اس عقدِ اتحاد کو ہمیشہ ہمیش کیلئے مضبوط تر و محکم تر کر دینے کا خیال آیا اور وہ ہمہ تن ادھر متوجہ ہو گیا۔

ملائے بدایونی[3] لاکھ گھوریں اور نظر لگائیں مگر جو ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا راجہ مان سنگھ و بیربل ہی ہمارے ہمراہ نہیں بلکہ ابو الفضل و فیضی کے ساتھ فتح اللہ

---

[1] سکندر کے بعد دوسری مرتبہ تعلیم عام ہوئی۔ ابو الفضل اسوقت کے نصاب کو یوں لکھتا ہے۔ اخلاق، ہندسہ، راجیومیٹری، ہیئت، اکونمی، سیاست مدن، فزکس، منطق، نیچرل فلوزفی، طبیعیات، مذہب و تاریخ ہندو مسلمان ایک مکتب میں ساتھ پڑھتے اور اسطرح قومی اختلافات مٹتے رہتے۔ ہندؤں کو علاوہ مذکورۂ بالا علوم کے دیا کرن، ویدانت اور پتن جلی بھی پڑھائے جاتے طالبعلم پر کوئی جبر و دباؤ نہ تھا جس فن کے مناسب اسکی طبیعت ہوئی اسے اس نے حاصل کیا اتنا لکھکر ابو الفضل یہ کہتا ہے کہ اس طریقۂ تعلیم نے بیحد فائدہ دکھایا اور اسکی بدولت ایسے ایسے فضلا نکلے جو واقعی ملک و سلطنت کے لئے باعث فخر ہیں۔

[2] ہندوؤں کے وقت میں شودر کو پڑھنا لکھنا منع تھا۔ مسلمانوں نے انہیں یہ آزادی بخشی۔ بعضوں کا خیال ہے کہ ہمارے کایستھ شودر ہی ہیں۔ دوات پوجا کی رسم تو اب تک باقی ہے یعنی سال میں ایک دن وہ اپنی تعلیمی آزادی کی خوشیاں کرتے اور دوات قلم آگے رکھکر اسے پوجتے ہیں اور واقعی یہ چیز ہے بھی پوجنے کے قابل۔

[3] ملا عبد القادر بدایونی صاحب تاریخ بدایونی۔ یہ ملا صاحب اکبر اور اسکے ارکین کے ہر فعل سے جلتے ہیں خود نورتن کے شریک ہیں مگر ہر رتن سے کٹے جاتے ہیں سلیم کی یہ شادی بھی ان کے لئے بھاگوان نہیں اور ایسا عقد اتحاد سازوار نہیں۔

(شیرازی) بھی ہمارے شریک ہیں! یہ عقد اتحاد بندھے گا اور ضرور بندھے گا۔ ہندو مسلم رشتہ مضبوط ہوگا۔ شہزادہ سلیم دولہ بنے گا۔ بادشاہ خود بیاہنے جائیگا۔ رجپوتوں کی عزت بڑھے گی۔ برات جمے اور رچے گی۔ منڈھا چھولیا جائے گا اور خوشی کا یہ گیت گایا جائیگا

پربت بالس کٹا موے بابل   نیے کا منڈھا چھواؤ رے

منڈھے اوپر کلس برا جے   دیکھیں راجہ راؤ رے

ان بولوں کے ختم پر دلہن کا چنڈول آئے گا۔ بادشاہ آگے بڑھے گا دولہ کو بلائے گا اور پالکی کو خود کندھا لگائے گا! سب کا دل بھر آئے گا۔ راجہ راؤ سامنے سیں گے۔ ہاتھ باندھ کر اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کریں گے اور بھرے دل سے کہیں گے ؎ تہاری (ہماری) بیٹی[۱] تمہارے محلوں کی چیری (لونڈی)، ہم باندگلام رے!

شہنشاہ اس پر متاثر ہو کر جواب دے گا۔ نہیں نہیں ؎ تہاری (تمہاری) رے بیٹی تہارے (تمہارے) محلوں کی رانی، تم صاحب سردار رے! (تم خود بڑے آدمی ہو)

اس پر ایک کوک پڑے گی۔ دلہن رخصت ہو گی اور رجپوتوں کی بیٹی اکبر کی بہو اور ملکۂ ہند بنے گی اور پاٹ رانی کہلائے گی۔

یہ سب کچھ ہوا! اور اکبر کی جہانگیری محل اس دن سے اتحاد کا راج گڑھ بنا۔ جہاں ہندی و فارسی مخلوط ہو کر شیر و شکر ہوئی اور پھر اچھی خاصی اردو بن گئی!

---

[۱] ایسے ایسے سینکڑوں گیت ہیں جو سینہ بسینہ چلے آئے ہیں ان ہی میں سے یہ گیت بھی اس وقت خاص کا ہے جبکہ اکبر راجپوتانہ بیاہنے گیا اس سے اس وقت کی معاشرت تہذیب سوم و زبان کے عقدے حل ہوتے ہیں جنہیں دلی اور خصوصاً قلعہ معلیٰ سے واسطہ تھا۔ شاہی تقلید پر ان کے گھروں پر ایسے ایسے گیت شادیوں کے وقت اب تک گائے جاتے تھے۔ اس خاص گیت میں محل، غلام اور صاحب سردار کے الفاظ پر غور کرو تو یہی اردو ہے جو اس وقت رائج تھی!

سلیم اور اردو

بابر کے بعد اور اکبر کی پنجاہ سالہ سلطنت میں ملکی زبان نے جو نیا جوڑا پہنا اور حاکم و محکوم دونوں کی دستار کا جیسا طرہ وہ بنی اس کا ایک مختصر سا نمونہ بھی پیش ہو چکا اور اس سے اتنا سمجھ میں آگیا کہ اب یہی زبان ہمارے راجاؤں کے گھروں اور شاہی محلوں کے اندر بے تکلف بولی جا رہی اور سلیم (جہانگیر) کی مادری[1] زبان بھی اب یہی تھی جہانگیر کے محلوں[2] نے تعلقات اور باضابطہ کر دیئے اور اب روزمرہ فارسی نہیں بلکہ یہی ہندی ہو رہا تھا۔

خرم (شاہجہاں) کی پیدائش پر جو جشن ہوا اور حرم سرا میں جو خوشیاں منائی گئیں وہ ترکانہ نہیں بلکہ ہندوانہ تھیں۔!

یہ پیدا ہوا تو ساری رچھوتی رسمیں برتی گئیں۔ زچہ خانہ تک گایا گیا دائی جی شہزادے کو گود میں لئے ہوئے ہیں مگر ہاتھ نہیں لگاتیں۔ موتیوں کے تھال سامنے ہیں مگر ان کے بھاویں کچھ نہیں لگتا۔ ایک ناز کے ساتھ سنا سنا کر کہتی ہیں کہ ؎

ماںگے ہے جودھا جی کا راج　　للا جی کا نال نہ چھواے
تھال بھر موتی جودھا رانی لائیاں　　وہ بھی نہ لیوے یہ دائی!

---

۱ جہانگیر کی ماں راجپوتانہ کی رانی تھی جس کا خطاب مریم زمانی تھا۔ وہ ہمشیرۂ والدۂ اکبر مریم مکانی کے ستاری اکی رحلت پر جہانگیر بیحد افسردہ ہوا اور اپنے تزک میں لکھتا ہے امید است تعالیٰ ایشان را غریق رحمت خویش گرداناد۔

۲ جہانگیر کے دو ہندو محل تھے اول راجہ بھگوان داس کی بیٹی اور دوسری مہاراجہ اودے سنگھ کی نور نظر۔ خرم اسی کے بطن سے لاہور میں پیدا ہوا تھا۔

یعنی میں تو جبتک رانی جی کا آدھا راج پاٹ لکھا نہ لونگی چھوڑونگی نہیں اور شہزادے (للاجی) کا نال کاٹنے والی نہیں! میرے آگے یہ تھال بڑا مال نہیں اسے اٹھا رکھو!

زبان اور اپنی اردو کی صاف وصحیح تصویر اگر دیکھنا چاہو تو انہیں بولوں کے شفاف آئینوں میں دیکھ سکو گے! ایسی زبان اور خوشی وغم کے یہی انداز اشراف گھرانوں میں ابتک باقی ہیں اور جہاں ہماری عورتیں اسپتالوں اور خیرات خانوں کی نرسوں کے حوالے نہیں کی جاتیں وہاں یہ چہل پہل ہنوز باقی ہے! انہیں جاننے والے سمجھتے ہیں کہ ہماری اردو کھلے بازاروں اور تنگ چوکوں کی ہوا کھا کر ہم تک پہنچی مگر نہیں اُس نے تو محلوں میں پرورش پائی اور ہمارے رجواڑوں اور شہزادوں شہزادیوں کی وہ صحبت اٹھا کر اور ادب قاعدہ سیکھ کر باہر نکلی اور ہماری ہم جلیس بنی ہے!

جہانگیر کے بے تکلفانہ اور شاعرانہ انداز کچھ چھپے ہوئے نہیں وہ صاحب قلم اور اپنے تزک کا مولف تھا۔ زبان کا شوق اور اسکی اصلاح وترقی اس کی بات بات سے ظاہر ہے جو نور جہاں کی بغل میں بیٹھا بادۂ ارغواں کو رام رنگی[1] کہکر یاد کرتا ہو وہ اپنی پاٹ رانی کے آگے کتنا کھلتا اور آخر کس روزمرہ میں باتیں کرتا ہوگا؟

ایک مرتبہ وہ سفر کشمیر میں ہے۔ جاتے جاتے بیچ ہزارا ایک مقام پر اترا اور وہاں کی فضائیت اور حالات دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا اور کہتا ہے کہ واقعی یہاں کی یہ کہاوت (جو عرصہ سے مشہور ہے) کتنی سچ ہے۔ ؎

---

[1] طالب آملی اس پر کہتا ہے ؎

نہ ایم منکرِ صہبا و لیک می گویم — کہ رام رنگی نا نشۂ دگر دارد!

بیچ ہزار انکا بھیلیاں، دھنی کھوب گائیں — سوسیکرتی گھوڑ بھلے اور ہشت نگر کے دھائیں

(گیہوں — خوب — گھوڑے — چانول)

یعنی بیچ ہزار کے گیہوں اور دھنی (مقام) کی گائیں خوب ہوتی اور اسی طرح سورسیکرتی کے گھوڑے اور ہشت نگر کے چاول مرغوب ہوتے ہیں!

اُردوئے معلّیٰ

شاہ جہاں کو زبان اردو پر وہی حق و دعویٰ ہے جو کسی صناع کو اپنی صنعت و کاریگری پر ہوا کرتا ہے اور جبتک یہاں کی یہ دو بڑی قومیں ہندو مسلمان زندہ ہیں اپنے اس ہندی شہنشاہ کی اس بے مثل صناعی اور اپنی قومیت کی نشانی کو یاد کرکے اسکی رُوح کو خوش کرتی رہیں گی!

تاج جمّا (جمعہ مسجد) اور قلعہ معلیٰ کی شاندار عمارتوں کے ساتھ اس اردوئے معلیٰ کی یادگار عمارت بھی اسی فیاض و سیر چشم بادشاہ کے مبارک نام سے قائم رہیگی یہ اردو کی گود میں پیدا ہوا اور اسی کے دامن میں پلا۔ اذاں کے بعد جو پہلی آواز اسکے کانوں میں پڑی، وہ اسی زبان کی صدائے خوش تھی! زچہ گیری اور چھٹی چھلّہ کے گیتوں راگوں اور لوریوں کے دھیمے سروں میں اُس نے اپنی اسی مادری زبان کے الفاظ سنے اور یہ اسی کا اثر تھا کہ خدیجۃ الزمانی کی گود میں رہکر بھی جب زبان پھوٹی تو دادا اکبر اکو شاہ[1] بابا اور باپ کو شاہ بھائی کہنے لگا۔

شاہ جہاں آباد بن چکا اور بادشاہ کے مبارک قدم ادھر آئے تو اردوئے معلیٰ کا شیر خوار بھی دامن دولت سے لپٹا ہوا ساتھ ساتھ آیا اس دن سے یہ طفل لال قلعہ میں اور شاہ جہاں کے سے سرپرست کی نظر کے سامنے پلنے اور بڑھنے لگا۔

[1] (دیکھو تحت صفحہ ٥٧)

اس بچہ کے ساتھ صاحب قرآن اول کے پوتے بابر کے پیار و اخلاص کا
حال گذر چکا۔ اب اسی بابر کے پروتے صاحب قران ثانی کی اس توجہ کی حکایت بھی
پڑھو جو خاندانی روایت قائم رکھکر اس معصوم کے حال پر مبذول رکھی گئی!

شاہجہاں نے اس شیرخوار پر صرف زبانی مہر و شفقت نہیں دکھائی بلکہ
دلی الفت سے اسے گود میں لیا اور منھ سے منھ ملاکر ہمیشہ اسے پیار کیا! جب شاہ
قلعہ آگرہ میں زچ ہوا تو گوشہ تنہائی میں اپنے اس طفل زبان سے کھیلا اور جی بہلایا کرتا!
اور جب شجاع عالمگیر کے مقابلہ سے بھاگا اور دار السلطنت سے دور ہوا تو
اسکے اور بادشاہ کے درمیان یہی معصوم واسطہ بنا رہا اور ابواب کے ساتھ جب شاہ پر
رسل و رسائل کا دروازہ بھی بند ہوا اور ہیکوں۔ قاصدوں کے پیر توڑے گئے تو حضرت
نے عالمگیر سے اس کا گلہ کرا بھیجا۔ شجاع کی تسلی اور امداد کی خاطر جو پرچہ پیغام
حجرۂ شاہ سے جاری ہوئے تھے ان میں سے ایک شقہ شاہی کی طرح اورنگ زیب کے
ہاتھ لگ گیا تھا۔ باپ کی تادیب پر جواب لکھا اور مراسم عبودیت بجا لاکر عرض کرتا ہے
کہ ہمارے دشمنوں (بھائیوں) پر حضرت کی نگاہِ لطف و کرم ابتک باقی اور غلام کے
خلاف ریشہ دوانیاں بدستور قائم ہیں۔ "آن فرمان عالی کے در زبان اہل[1] ہند از
دستخط خاص رقمی فرمودہ شاہد ایں معانی است!

آپ کی زبان کے سرچوں میں سے غالباً یہ نیا سرچ ہے یہ زبان ہندوی
شاہجہانی اردو ہے جو اس شاہ کی نسبت سے قلعہ معلی کی طرح اردوئے معلی کے

(نوٹ صفحہ ۵۶) خرم پیدا ہوا تو اکبر خوش خوش اسے اپنی ملکہ خدیجۃ الزمانی کی گود میں ڈال آیا وہ لاولد تھی اور خرم کو بیٹا بنا کر
پالا۔ خدیجۃ الزمانی ہند ال مرزا کی بیٹی اور ترک تھیں انکو اردو سے کیا نسبت [1] دیکھو مراسلات عالمگیر و شاہجہاں

لقب سے مزین ہوئی اور اس سے آپ اپنی زبان کی بزرگی و ترقی کو بخوبی سمجھ سکتے اور اس بادشاہ کے ساتھ اسکی نسبت کی وجہ اب بآسانی معلوم کر سکتے ہیں!!

دارا ولیعہد سلطنت اور خوبوں میں صاحب قران ثانی اور ادب و لٹریچر کے شوق و ذوق میں اپنے بزرگوں کا خلف الرشید تھا! اسے تخت نصیب ہوتا تو اتحاد زبان کا نشان اور بلند ہو جاتا۔ بھاشا اور سنسکرت سے اس کا تعلق و اخلاص پوشیدہ نہیں ویدمت کو سمجھتا اور گیتا کا شیدا تھا جس نے اپانی سادشس کو سرالاسرار بنایا اور جوگ وششٹا کو فارسی جامہ بخش کر دیبالی لی زبان کو چمکایا اور اپنے گرو بابا لال[1] داس پنڈت اور اپنے برہمن[2] منشی و دیوان چندر بھان کے سے شاعر و ادیب کی مدد سے اپنی مادری اور باپ کی پیاری زبان کی کہاں تک خدمت نہ کرتا لیکن مشیت اس کے خلاف تھی اور اسکی انگوٹھی کے نشان پربھو[3] (غالب) کو دیکھ دیکھ کر ؎

زبس راجپوتاں پر کار جنگ — گذشتند از جاں بناموس و ننگ
فتاد آں قدر کشتہ در کارزار — کہ شد بستہ راہ گذر بر سوار

مگر اس پر بھی اس کا نشان آخر سرنگوں ہی رہا اور اردوئے معلی کا علم اس وقت اور بلند نہ ہو سکا!

عالمگیر اور اردوئے معلّیٰ

ترکی ہندی اختلاط اور صدیوں کے میل ملاپ سے بھاشا نے کیچلی

---

[1] دیکھو مکالمۂ بابا لال داس۔ [2] یہ وہی برہمن ہیں جن کا یہ مشہور شعر ہے۔

مرا دلیست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار — بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

[3] پربھو غالب کے معنی میں ہے دارا نے اس لفظ کو مبارک سمجھ کر اپنی انگوٹھی پر کندہ کرایا تھا۔

اُتار کر جو صورت نکالی اس کا نام اردو ہے۔ اور پھر مغلی و رجپوتی سرکار دربار میں جس طرح وہ پوچھی گئی اور منصب عالی تک پہنچائی گئی عرف عام میں اردوئے معلی کہتے ہیں! اس اردوئے معلی اور عالمگیر نے ایک ہی گھر میں ہوش سنبھالا اور اس سے ایک کا دوسرے پر اثر محتاج بیان نہیں۔ عالمگیر اب ترک نہیں بلکہ اچھا خاصہ ہندی تھا۔ اس میں اپنے بزرگوں کے بہت سے اوصاف تھے اگر مید ان جنگ میں سر لشکر رہا تو اپنے دیوانخانہ میں بھی سر دفتر دکھائی دیا۔ زبان کا شوق اسمیں فطری و موروثی تھا اور جہانگیر و شاہجہاں نے اگر یہاں کے شعرا و خصوصًا تلسی داس کو شرف حضوری بخشا تو کبیر کا ساربان اور کوی زمانہ وبعہدی سے اس کے دامن سے لپٹا رہا اور یہ وہی نامی کبر ہے جس نے زبان تشنہ بنکر جسونت سنگھ[۲] سے گفتگو کی اور حق سفارت ادا کر آیا۔ زبان کے شوق اور یہاں کی بھاکھا سے اسکی الفت کی انتہا یہ ہے کہ جب بنگالہ سے ایک شخص اُس (بادشاہ) کا مرید ہونے آتا اور صلابت خاں میر توزک اسے حضور میں پیش کرتا ہے تو وہ (بادشاہ) اس پر مسکراتا اور عربی و فارسی شعر کی جگہ بے اختیار ایک پنجابی نظم اور کہاوت اسکی زبان پر جاری ہو جاتی ہے!

عالمگیر علوم و فنون کا سرپرست اور ادب اور انشا کا مربی تھا اور باخبر و مصنف دنیا اُسے راجہ بھوج اور سکندر لودی کے بالمقابل سمجھے گی تو دُرِ ل کی

---

[۱] پڑھو اس کے رقعات! وذ شر میں نظم کا مزا اٹھاؤ [۲] دیکھو عالمگیر کے خلاف جسونت سنگھ کی معرکہ آرائی کا حال [۳] (دیکھو حاشیہ صفحہ ۶۰)

تعلیمی اسکیم اسکی توجہ کی ممنون اور یہاں کی تعلیم عامہ اسی کی فیاضیوں کی زیر بار احسان ہے۔ جبکہ طلباء کے لئے ایک آنہ سے لیکر آٹھ آنہ روز تک مقرر ہو اور وظائف کا یوں مینا برسا دیا جائے تو پھر کشت علم کیونکر نہ سبز ہو اور تعلیم کا چرچا کسطرح گھر گھر اور عام نہ ہو جائے[۱]۔ اور اس کے یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ اس جگ کی اکنی اس کلجگ کی اٹھنی پر بھاری تھی۔

اس مربیٔ علوم نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ مقتضائے وقت کو سمجھکر اس ملک میں آج سے تین سو برس قبل بے طلب اس جبری تعلیم کی بنیاد بھی ڈالی جس کی اس وقت ضرورت دکھائی جا رہی اور جیسے آپ کا ایک خیر خواہ[۳] اپنی آخری سانس تک مانگتے چلا گیا ہے۔ جس وقت عالمگیر آپ کے بھائی بوہروں کی علم و تعلیم سے بے خبری کی حالت سنتا ہے بیچین ہو جاتا ہے اور فوراً معلمین و استاد مقرر کر کے ان تک بھیجتا ہے اور جب اس پر بھی دنخواہ رپورٹ نہیں آتی تو اپنے فرائض کو سمجھکر ان کے لئے جبری[۴] تعلیم کا حکم و قانون نافذ کر کے انہیں انسان اور دنیا میں جینے کے قابل بنا دیتا ہے جو علم و تعلیم کا ایسا حامی[۵] زبانوں کا ایسا سرپرست اور ادب و انشاء کا ایسا مربی ہو وہ اپنے بزرگوں کی یادگار اردوئے معلیٰ کا کہاں تک خیال نہ رکھتا ہوگا اور گو وہ خود کہتا ہے کہ ؎

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵۹)

۳ے "توٹی پسندی بادرہ"۔ وینڈی کھڑے ہنج ؛ چوہا مکدن باؤلی تو گل باندھے چھج! یعنی چوہا بل میں نہ سمائے اسکی دم میں باندھے چھاج (سوپ) ہولی اپنے پتوں آپ بھاری میں کیا کسی کو مدد کر سکتا ہوں یہ کہکر حکم ہوا کہ اسے کچھ دے دلا کر رخصت کر دو (دیکھو سوانح سال سی و سوم ہ) ا ہ دیکھو مرکین کی مغل امپائر ۲ھ دیکھو مراۃ احمدی از محمد خان تاریخ فرخ بخش از محمد فیض بخش ۱۲ ۳ھ مرحوم گوکھلے۔ ۴ھ دیکھو ایڈ (انگریزی) جلد اول صفحہ ۳۷۷، ۳۷۸ ۵ھ پڑھو ملا صالح اور بادشاہ کی علم و تعلیم پر گفتگو معلوم ہوتا ہے کہ کسی یونیورسٹی کا کوئی فاضل چینسلر تقریر کر رہا ہے۔

غم عالم فراواں ست و من یک غنچہ دل دارم　　　چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگ بیاباں را

لیکن اس پر بھی اسکی سلطنت کے باغ میں ایسے پھول ہم کو نظر آجاتے ہیں جو غنچۂ خاطر کو کھلا اور ہماری بزم کو جلا دیسکتے ہیں اور حق پوچھو تو یہی وہ گلِ سادہ ہیں جن کے بے میل رنگ میں ہماری سچی تصویر جھلکتی اور نظر آیا کرتی ہے۔

کچھ قبل ایک شادی کا منڈھا چھوایا جا چکا اور اس کے بعد ہی ایک چرخہ گوایا جا چکا ہے وہ خوشی و وصال کا ترانہ تھا زمانہ بدلتا اور اب جدائی و فراق کا فسانا سناتا ہے۔

عالمگیر دکن پر چڑھا ہوا ہے۔ لاؤ لشکر ساتھ ہے ہون کا لالچ مردوں کو بٹور کر ادھر لے گیا اور عورتیں گھر میں ہیں۔ برسوں گذر گئے دلی خالی اور سونی پڑی ہوئی ہے اور دلی والیاں اکیلی فراق کی راتیں گذار رہی اور دکھ بھر رہی ہیں۔ کہیں سے خبر نہیں آتی دل اداس اور قلب بیچین ہے اور جب کچھ بس نہیں چلتا تو دکھن کی طرف منھ کر کے پکارتی اور اپنی بیتی نہیں گھر کا حال سناتی اور کہتی ہیں ؎

چھپرا پرانے ہو گئے کڑکن لاگے بانس ؛ دیکھو یہ گھر گرا یہ چھت آئی دبے اور مرے

جواب نہیں ملتا تو ہار کر اور گھبرا گھبرا کر کاکی خوشامد ہوتی اور اس کے ہاتھ سندیسیا (پیغام) بھیجا جاتا اور گلہ کیا جاتا ہے کہ ؎ آؤں آؤں کہہ گئے بیت گئے بارہ ماس ؛ کیسے سچے اور وفادار ہو۔ ایک جگ گذر گئی اور خبر نہ لی! اس سے بھی خاطر جمع نہیں ہوتی تو کلیجہ اور پھٹتا اور اس میں سے آواز آتی ہے ؎

دلی سہر سہاؤنا اور رنگین برسے نیر　　　سب کے کنٹھ بٹور کے لے گئے عالمگیر

اس فریاد پر یہ روکھا پھیکا جواب ملتا ہے کہ ؎

بیٹھی رہو کر راسے من میں رکھو دھیر — اکبے بچھڑیں جب ملیں جب بو ہریں عالمگیر

تو حوصلہ صبر اور رجا تار ہتا اور جینے سے یاس ہو جاتی ہے۔!!

یہی وہ زبان تھی جو اس صدی میں رائج رہی اور اسے سوا اردو کے کچھ اور سمجھنا زبان کے آتار چڑھاؤ اور اس کے مدارج سے بے خبری و لاعلمی ہے۔

محکوم کا اثر حاکم پر!

حاکم زبانیں محکوم زبانوں سے بہت کم دبتی ہیں۔ عربی بھی فارسی سے زیر نہیں ہوئی۔ مگر ہند کی خاک بڑی عنان گیر ہے۔ اس نے ترکیوں، فارسیوں کا لباس ہی نہیں اُتارا اور اُنکا ہتھیار ہی نہیں کھولا بلکہ انکی شمشیر زبان کو یہاں کا پتھر بھی چٹا چھوڑا۔!

بلا بہادر اپنے دیوالا ولدیو میں بلرام جیت ولاس میں بھرتری اپنے بھجوں میں بھاؤ نند داس امرت دھارا میں چند کوی پرتھی راج سارا میں اور بہاری لعل ست سئے اور اپنے مشہور دوہوں میں اگر حاکم وقت کی زبان بھی بول گئے تو کیا تعجب یہی مشہور بہاری آنکھ کی تعریف میں کہتا ہے ؎

امی ہلاہل مدھ بھرے سیت شیام رتنار — جیت مت جھک جھک پرت جہ چتوت یکبار

زبان کے لوچ، نیچرل شاعری اور اُس کے لف ونشر پر تو بعد کو نظر کرنا اسوقت اس شام یعنی سانجھ کی بہار تو دیکھو اور اس ایکبار پر پھر ایک بار نظر تو کرو! اور اسی طرح اگر براج لبسی داس کی مثنوی راج بلاس میں چھتر پوس۔ مصر کرشن جی کے حال اور اپنی بیاس میں کبیر و نانک اپنے درود و وظائف میں کرشنا معاصر و معاون

ابوالفضل اپنی نئی گیتا میں لال کوی، چترا پرکاش میں اور موتی رام قصہ مادھولال میں نابھاجی اکبری اور کیشوداس جہانگیری؟ اپنے خزانۂ دماغ میں سکۂ رائج الوقت کو بھی محفوظ کرنے لگے تو چنداں حیرت کی جگہ نہیں۔ اور بہاکوی (ملک الشعراء[۱]) سندرداس کی سندر سنگار مشہور سورداس کی نل دمن اور واجب التعظیم تلسی داس کی رامائن اور خصوصاً ان کے آبدار دوہوں[۲] کے نگینوں میں اگر عربی و فارسی کے بھی جوہر چمکے تو تعجب خیز نہیں۔ مگر فارسی تیغ پر ہندی جلا البتہ حیرت انگیز ہے!

یہاں پر اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ جب ایک قوم دوسری قوم سے بدل ملتی ہے تو اسکی ہر ادا بھلی لگتی ہے۔ معاشرت مغائرت کی قاتل ہے اور دو غیروں کو ایک کردیتی ہے ان دو قوموں (ہندو مسلمان) کا بھی یہاں اسی طرح رشتہ جڑا۔ شاہ نے اپنا لباس آتارا تو رعایا نے بھی اپنا جامہ بدلا۔ مراد کو بہاڑی راجہ خطاب ملا تو مان سنگھ بھی مرزا راجہ بنا!

جائسی پدماوت[۳] کو سراہنے اور عبدالرحیم خان خاناں کوئی[۴] نکر دوہوں کو سرتاج بنانے بیٹھے تو ادھر ڈونگرمل اور چندربھان بھی اچھے خاصے شاعر ہو گئے

۱؎ بہاکوی (ملک الشعراء) سندرداس کو شاہجہاں بہت عزیز رکھتا اور ہمیشہ انعام و اکرام سے سرفراز کیا کرتا۔ سندر سنگار اسکی مشہور تصنیفات میں ہے بادشاہ کی فرمائش سے یہ سنگاسن بتیسی کو بھاشا یا اسوقت کی اردو کے قالب میں لایا۔ یہ پرانی چیزیں ہند کے خزانہ سے نکلکر یورپ پہنچیں اور برلن و پیرس میں ان کا بڑا ذخیرہ ہے دیکھو وہاں کی لبریری کے کیٹلاگ۔ ۲؎ گھر لسو آسن بجن ہٹ بولے۔ کتنی بھنتا کلہ بھی کھولے گنی گریب گرام نزناگو۔ پنڈت موٹے ملین جاگو سے مایا کو مایلے کر کر لمبے ہاتھ ؛ تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات ۳؎ ملک محمد جائسی پدماوت (لنکا کی رانی اور رتن سنگھ چتوڑ کے راجہ کی کہانی) کے علاوہ اس کی ایک اور مثنوی راگنی سورات بھی ہے مگر وہ مشہور نہیں ہوئی۔ ۴؎ (دیکھو حاشیہ صفحہ ۶۴)

تالی دونوں ہاتھ بجی اور ایسی آواز پھر دنیا نے نہیں سنی۔

وہ آواز جو تین سو برس قبل گونج رہی تھی آج شاید مدھم پڑ گئی ہے یہ محفل کن رسوں سے خالی نہیں۔ ذرا چھیڑ ہو تو دل گرمائیں اور اگلی محبتیں یاد آئیں۔ دیکھنا ادھر سے بھی کوئی تکلف نہ ہوگا اور یہاں غیر نہیں ہاں دوست سمجھ کر تصرف ہوگا سب کے سب پہلے لیجئے کٹاری ہی سامنے آتی ہے کہ پرانی وضع کی نشانی اور یادگار ہے وہ یادیوں تازہ ہوتی ہے ؎

سر آں دو چشم گردم کہ چوں ہندواں رہزن
ہمہ را بہ نوک مژگاں دہ بر جگر کٹارا

جمدھر بہادر رجپوتوں کا خاص ہتھیار ہے۔ دیکھو طغرا کنائے کنائے میں ان سمدھیوں[۵] کو کیونکر چھیڑتا ہے۔

شیخ سوسن را بگو دل می رباید تشقہ ات
ذات رجپوت ست دست بر جمدھر کند

متھرا یعنی برج کے سبزہ پر دل لوٹ پوٹ ہے۔ ٹھوکر کا بھی خیال نہیں مست شاعر

(بقیہ صفحہ ۶۳)

---

۴ خانخاناں کے دوہے مشہور ہیں جیسے ؎ نین سلونے ادھر مدھو کہو رحیم گھٹے کون میٹھا بھاوے لون پر اور میٹھے پر لون (یعنی نمکین آنکھیں اور لب شیریں بتاؤ رحیم جیا کون موئی بھی نہیں سلئے کہ نمک کے بعد میٹھا اور میٹھے کے بعد نمک مزا دیتا ہے۔) دیکھو زبان ہی نہیں مذاق بھی ہندی ہے اور اخلاط کے یہی معنی ہیں یہ وہی فیاض عبدالرحیم خان خاناں تھا جن کا وسیع دسترخوان مشہور رہا اور یہ مثل ہوگئی ع خانخاناں جن کے کھانے میں تہا نا قابوں و پیالوں میں سونے چاندی کے چھلے بتانے چھوڑ دیئے جاتے تھے کہ غریب نکالیں اور اسے بھی کھائیں اور ہمارے یہاں کونڈوں میں اب تک یہی دستور رہا مگر کونڈے لکھنے والے تو اب بھی بہت ہیں لیکن کونڈے کرنے والے کہاں مشہور میاں فہیم (کمائیں خانخاناں اڑائیں میاں فہیم) ان ہی کی ناک کے بال تھے اور یہ سننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہاں فہیم اصلاً برہمن تھے ع بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا

۵ رجپوت اور کچھ نہیں تو ترکوں کے سمدھی ضرور تھے!

شاعر آنکھ بند کئے اُدھر چلا جاتا ہے ؎

چوں زندبنر قہوۂ عرفی از پاڑند حسن　　بہر زیب نطق مصحف خواں گل از بر کند

عالی بیچارہ کو جب یہاں کچھ نہیں تو سکھ ہی مانگنے لگتا ہے۔ مگر دیکھتا منھ کیونکر کھولتا ہے ؎

اینجدا عالی بیچارہ بہ ہند آمدہ است　　نازنین شوخ ظریف سکری میخواہد

عرفی اپنی باد تند کو بھولتے اور ہمارے جھگڑے کو یاد رکھتے ہیں مگر کیا خوب یاد رکھتے ہیں ؎

در جا تشنگہ از شبنم گل گرد فشانست　　آں باد کہ در ہند اگر آید جسکر آید

سالک یزدی پلاؤ کھاتے کھاتے تھکے تو ہماری کھچڑی کی طرف بڑھے مگر پچی نہیں اور پیٹ بجا کر کہنے لگے ؎

زسیر گشتم زکچڑے ایام　　ہوس سیم و زرہی دارم

واہ کیا خوب جوڑ ملایا اور کس مزے کی کھچڑی بکائی ہے! طالب آملی ایک مرتبہ جھوم کر جو اٹھے تو جہانگیر پر نظر جا پڑی اور ولایتی کو چھوڑ کر دیسی کا مزا لینے لگے جماہی لیکر فرماتے ہیں ؎

نہ ایم منکر صہبا ولیک می گویم　　کہ رام رنگی[1] ما نشہ دگر دارد

کلیم زور زبان دکھانے اٹھے تو یوں گرے کہ سنگ سنگھ سے توڑ بیٹھے شاہجہاں کا سامنا ہوا تو لگے خفت مٹانے ؎

سر راجو تاں جگت[2] سنگ بود　　کہ برشیشہ نہ فلک سنگ بود!

---

[1] رام رنگی جہانگیری دو آتشہ ہے　[2] دیکھو شاہجہاں نامہ ۱۲

اور تو اور اس ریلے میں ہمارے چند برہمن بھی اپنی قومیت کا ٹیکہ مٹاتے اور برا منہر کی جگہ برہمن کا تلک لگائے لیتے ہیں۔ سنئے ؎

مرا ولیست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

اور پھر مزا یہ کہ اب سب یوں ہی بولنے بھی لگے۔ چنتامنی کی تو خبر نہیں مگر ہمارے مالوجی کی تو اب یہی زبان ہے!!

دوسرا دور مرہٹی یا دکھنی

یہاں کی مختلف بھاکھا اور زبانوں کے ذکر میں مہاراشٹری کا نام آچکا ہے اس بھاکھا کو اپنے صوبہ مہاراشٹر یعنی دکھن سے نسبت تھی۔ ملک دکن سلطان علاؤ الدین خلجی کے عہد اور ملک کافور کی حکمتوں سے بارھویں صدی عیسوی میں ہاتھ آیا۔ اور جیسے وہاں ایک نئی زبان (فارسی) اور ایک نئی معاشرت کا اثر پڑا۔ تاریخ دکھن کی سیر آخر ان ہی نتائج تک پہنچاتی ہے جو شمال ہند میں ہمارے ربط و اتحاد کے سبب سے پیدا ہوتے رہے۔ ان ہی اثرات سے وہاں بھی ایک انقلاب آیا اور مہاراشٹری بگڑ کر مرہٹی بنی اور نئے تعلقات سے وہ آخر دکھنی[۱] کے موزوں خطاب سے سرفراز ہوئی۔

دکھنی یا اُردُو

آپ اپنی بھاشا کے اقتدار و افضلیت کا حال پڑھ چکے ہیں اردو اس کی قائمقام تھی۔ اس لئے اس کے سامنے بھی کسی اور زبان کے چراغ کا جلتے رہنا آسان

---

[۱] جو مرہٹی اسوقت رائج ہے وہ پرانی مرہٹی و دکھنی کی ایک غیر فصیح شکل تھی جسے اب آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

نہ تھا۔ ہند و دکھن کے تعلقات جب بڑھے تو دکھنی اور اردو بھی گلے ملیں ہمایوں کی فتح گجرات کے بعد اور سلطان بہادر کے زوال پر شمال و دکھن میں گہرا رشتہ قائم ہوا اور دونوں جگہ کی زبانیں ملنا اور پھیلنا شروع ہوئیں۔ یہ چونکہ مزاجاً دو نہ تھیں آخر ایک ہوئیں اور جب اردو کی سروری کا وقت آیا تو اپنے پرانے اقتدار کے باعث ملک دکھن کو بھی اس نے زیر اثر کر کے اس دکھنی پر قبضہ کر لیا اور یوں شمشیر و زبان بن بیٹھی!

دکھنی دربار

انقلابوں کے بعد جب دکھنی ریاستیں (بیجاپوری) نظام شاہی وغیرہ علیحدہ وخود مختار ہوئیں تو ان کا نظام مملکت بھی شاہان ہند کے اثر سے آزاد اور ملکی اثرات کو جلد جلد قبول کرتا رہا۔ بوبوجی[1] و بھاگ متی[2] فارسی، مرہٹی رانیوں اور گنگو برہمن[3] کے سے مشیر ملک کی قوت و اقتدار سے نظام مملکت میں اور تبدیلیاں ہوئیں ملکی زور اتنا بڑھا کہ دفتر تک کی زبان دیسی (دکھنی) ہو گئی[4] اور عادل شاہیوں[5] اور نظام شاہیوں[6] کے وقت میں گو ظہوری و محمد قاسم فرشتہ اپنا زور لگاتے رہے مگر ملکی زبان روز بروز بڑھتی ہی اور عام ہوتی ہی چلی گئی اور خیالات و جذبات کا اظہار بھی آخر اسی دکھنی

۱؎ بوبوجی مکند راؤ مرہٹہ کی بہن اور یوسف عادل شاہ کی منکوحہ تھی اس نے دکھن کے پولیٹکل تھیٹر میں بڑے پارٹ لئے ہیں ۲؎ بھاگ متی سلطان محمد قلی کی وہ معشوقہ ہے جس کے نام پر بھاگ نگر آباد ہوا جو بعد کو حیدرآباد دکن بنا ۳؎ گنگو مرہٹی برہمن تھا اور یہ پہلا شخص ہے جو فارسی پڑھ کر بہمنی سلطنت کا مشیر بنا ۴؎ ابراہیم عادل شاہ کے وقت میں دفتر مرہٹی یا دکھنی ہو گیا اور یوسف عادل شاہ کے زمانہ میں تو ایک قسم کی سلف گورنمنٹ قائم ہو گئی تھی ۵؎ نظام احمد شاہ اصلاً برہمن تھا۔ یہی خاندان بھیرو کر کے مشہور رہا اور بعد کو بگڑ کر بحری ہو گیا۔ اسماعیل نظام شاہ کی ماں کوکنی تھی!!

میں ہونے لگا!

دکھنی اردو کی شمالی اُردو پر افضلیت

اردو کی ہزار سالہ تاریخ اب آپ کے پیشِ نظر ہے اور اس کے ملاحظہ کے بعد خیال جاتا ہوگا کہ جس زبان کو بابر نے منھ لگایا اور جو شاہجہاں کی چہیتی کہلائی اس کا جوڑا دلّی کے لال قلعہ میں قطع ہوا ہوگا۔ ہونا تو یہی چاہئے تھا مگر ایسا ہوا نہیں! بلکہ اس کے برخلاف اس کا جامہ دکھن اور وہاں کے معمولی گھر میں تیار ہوا۔!

کیا سچ کہا ہے ضرورت ایجاد کی ماں ہے، ان اطراف میں ایک عرصہ تک فارسی عام اور حاکم و محکوم دونوں کے قلم کی زبان بنی رہی اس وجہ سے اظہار مطالب کے لئے کسی اور آلہ کی عرصہ تک ضرورت پیدا نہ ہوئی۔ برخلاف اس کے دکھن تھا جہاں عوام کی طرح سرکاری دفتر تک کی زبان ملکی ہو چکی تھی۔ جذبات و خیالات عرصہ تک گھٹ کر رہ نہیں سکتے وہ راہ ڈھونڈھتے اور کسی نہ کسی شکل میں نکلنا چاہتے رہیں۔ وہاں (دکھن) فارسی مٹ چکی اور ملکی زبان (دکھنی) اسکی جگہ لے چکی تھی۔ اظہار جذبات کی ضرورت جس وقت عام اور ناگزیر ہوئی اسی نئے آلہ (دکھنی اردو) سے وہ ضرورت پوری کی گئی۔ اور اس طرح اس ایجاد نے جنوب کو شمال پر فوقیت دیکر افضلیت کا تاج دکھن اور دکھنی کے سر پر رکھدیا!!

اُردو کا پہلا جامہ

دکن کی یہ ریاستیں (بیجاپوری، نظام شاہی وغیرہ) ہند سے علیحدگی

خود مختاری کے بعد اپنی وضع و آئین میں کسی کی پابند نہ رہی تھیں اور جبکہ یوسف عادل شاہ نے مملکت بیجاپور قائم کی تو اپنی نذر کے مطابق خطبہ میں آئمہ اہلبیت کے مقدس ناموں کو بھی شریک کیا اور انہیں پاک حضرات کے توسل کو اپنا ذریعہ نجات سمجھتا رہا جب سے اس سلطنت اور پھر نظام شاہیوں اور بعد کو قطب[1] شاہیوں میں مجالس میلاد و مجالس عزا کا دستور[2] ہو گیا!

ان مجالس میں عموماً پرانی ملکی زبان اور فارسی شعراء کا کلام اور خصوصاً محتشم کے بند و مراثی پڑھے جاتے تھے مگر وہ اب دونوں زبانیں متروک ہو چکی تھیں اور دکھن اپنی زبان کا متلاشی تھا۔ یہ ضرورت پوری ہوئی اور بہت جلد اس نئی زبان (دکھنی) کے مرثیہ گویوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جس کا سالار و سرتاج شجاع[3] الدین نوری نکلا یہ وہی نوری ہے جس نے آپ کی زبان کو روشن و منور کیا اور یہی وہ پہلا خیاط ہے جس نے وہ جامہ قطع کیا جو آپ کی اردو کے قدِ موزوں پر درست و چست نظر آیا اور اس سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو کی بنا اخلاق[4] پر ہے اور اس اردو کی زبان

۱؎ گولکنڈہ میں ابراہیم قطب شاہ کا لنگر خانہ و امام باڑہ عرصہ تک مشہور رہا ۲؎ اس عزاء غم کا چرچا اس نرم و گداز ملک میں خلجیوں اور تغلقوں ہی کے وقت سے ہے اور ایرانیوں اور تورانیوں کے ساتھ ہندیوں نے بلکہ اس فکر کو کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ قائم اور اپنی ملکی ٹھیٹھ زبانوں میں اس نوحہ و ماتم کو جاری رکھا جس کے آثار اب تک باقی ہیں عادل شاہی اس کے موجد نہیں انہوں نے اس پرانی رسم کو باضابطہ کر کے تازہ کر دیا اور بس! ۳؎ شجاع الدین احمد آبادی نہیں بلکہ اصل بیجاپوری تھا۔ مرزا جان (اکبری) جو کہ خود ایک بڑا شاعر و ادیب تھا۔ نوری کی قدر کرنے لگا اور جب اکبر کے حکم سے وہ گجرات کی طرف گیا تو نوری بھی ساتھ تھا اور احمد آباد میں عرصہ تک رہا (دیکھو تاریخ فتح گجرات از ملا امیر کابلی قلمی) انسائیکلوپیڈیا میں نوری کو ہمعصر فیضی لکھا ہے یہ سچ ہے مگر ان کا احمد آبادی ہونا غلط قائم و کمال نے بھی اپنے تذکروں میں یاد کیا اور گارسن دی تاسی (فرنچ) بھی اسے بھولا نہیں ہے مگر اس کا کلام کسی نے نقل نہیں کیا۔ ۴؎ سوا اردو کے کسی زبان کی بنیاد اخلاق پر نہیں پڑی اور جملہ موجودہ زبانوں پر اسی سے اس کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے

پھوٹتی ہے تو اس ذکر میں جس ذکر نے عالم میں ایک صحیح و سادہ اخلاق پھیلایا اور ہمیشہ پھیلاتا رہے گا۔ موجودہ زبانوں میں سوا اردو کے کسی کو یہ شرف حاصل نہیں کہ اس کے نظم و نثر کی بنیاد کسی اخلاق پر رکھی گئی ہو۔ نظم کا حال تو معلوم ہو چکا اب نثر کا قصہ آگے آتا ہے

ابراہیم عادل شاہ کے وقت تک یہ ذکر عام ہو چکا تھا اور ظہوری نے جہاں اس (ابراہیم) کی نورس پر ایک جید تقریظ (سہ نثر) لکھی وہاں ضرورت سے مجبور ہو کر مرثیہ کہنے بھی بیٹھ گیا۔ اور پھر اس رواج نے اتنا زور پکڑا کہ ہاشم علی[۱] برہان پوری نے تو اس کے لئے اپنے کو وقف کر ہی دیا۔ یہ شخص آپ کی اردو نظم بلکہ اخلاقی نظم کا وہ دوسرا لائق تمجید بانی ہے جس کی محنت شکر ہے کہ رائیگاں نہیں گئی اور ایڈن برا (اسکوٹ لینڈ) یونیورسٹی کی مشہور لائبریری میں اس کے کلام (مراثی) کا ایک اچھا حصہ اب تک موجود و محفوظ ہے!!

پرانی تحقیقات کی بموجب چونکہ ولیؔ نظم اردو کا باوا آدم تسلیم کر لیا گیا ہے

---

[۱] ہاشم علی برہان پوری تھا اور اس کی نشو و نما نظام شاہیوں اور عادل شاہیوں کے وقت میں ہوئی اور زمانہ جہانگیر کا ہے اس نے زیادہ تر مرثیے ہی لکھے اور اسی میں نام نکالا۔ ایک قطعہ مرثیہ کا ملاحظہ ہو۔

مرثیہ

کوئی نہ تھا بیگانہ از بند و خطا   ظلم تھا سب خویش و سب اقوام کا
ختم ہے یو امتحان و یو بلا   ختم ہے جو حق تیں پیغام کا
تھا برادر اولاد شفیع المذنبین   ظلم بیحد در جہاں اقسام کا
زخم لاگا مرتضیٰ کے سر اوپر   گر پڑا جوں آفتاب اس بام کا
زہر دے مارے حسن کوں کر سیں   سبز تھا وہ چہرہ گلفام کا
کربلا میں تھا حسین ابن علی ہے   آج لگ ہے گا انھیں ایام کا

(دیکھو مراثی ہاشم علی در ایڈن برا یونیورسٹی لبرری)

اس لئے یہ بھی یقین کر لیا گیا ہے کہ غزلوں سے اس زبان کی ابتدا ہوئی اور پھر سمجھ لیا گیا کہ محض گل و بلبل سے اسکی آشنائی رہی اور اس وجہ سے ہماری اردو کا دائرہ تنگ نظروں میں ہمیشہ تنگ ہی نظر آیا۔ تلاش و تحقیقات کے دروازے بند نہیں ہیں اور آپ نے ذرا توجہ کی تو ریسرچ اس زبان کے اور بہت سے راز آپ پر کھول دیگی اور اس وقت آپ کو اپنی اردو کی قدامت و سعادت و وسعت و ہمہ گیری معلوم ہو سکے گی!

دکھنی شاعری اور اس کا زوال

نوری و ہاشم کے بعد دکھن میں دکھنی اور مرثیہ گوئی نے اور ترقی کی۔ رام راو[۱] اور سیوا[۲] نے جو بعد کو نام نکالا اور پھر کاظم علی[۳] نے مرثیہ گوئی کے ساتھ ساتھ ادب و

---

[۱] رام راو قطب شاہی ہندو امیر ہے جس نے رامائن کا خلاصہ دکھنی نظم میں کیا! اس نے مرثیے بھی کہے (تذکرہ قاسم) [۲] سیوا ایک مشہور دکھنی مرثیہ گو ہے اور اس نے روضۃ الشہدا فارسی میں ۱۸۱ء میں عہد عالمگیرا لکھی قانون اسلام (فارسی) ایک کتاب بھی اسکی مشہور ہے (تذکرہ تاسی) [۳] کاظم علی نوری و ہاشم کے بعد مرثیہ گوئی میں یہ بھی شہرۂ آفاق ہوا۔ اس کے ایک مرثیے کے چند شعر یہ ہیں ؎

اے نابکار ان دیں کا چھتر گرانا کہاں روا
سرور نبی کی آل کوں یو دکھ میں لے آنا کہاں روا

رکھنا امام دیں کے تئیں جنگل میں بے آب و نان
طفلاں کو انکے بے گنہ غم میں رلانا کہاں روا

جن کو بٹھاتے تھے نبی دوش مبارک پر مدام
نیزہ پر انکے سر کے تئیں رکھکر پھرانا کہاں روا

وہ اصغر معصوم کوں سرور حسینؑ کے ہاتھ پر
پیکاں کے آب ہر سوں شربت پلانا کہاں روا

کاظم کے مراثی بھی ایڈنبرا یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود و محفوظ ہیں یہ اشعار وہیں سے نقل کئے گئے۔ کاظم کی جنگ سہراب رستم والی مثنوی کا انگریزی میں بھی مسٹر آبٹ کنس نے ترجمہ کیا (دیکھو تاسی)

وانشاء کا شوق اتنا بڑھا کہ دلی و لکھنؤ کی طرح گھر گھر شاعر[1] پیدا ہونے لگے خود (وہاں کے) شاہوں نے دکھنی کو سرفراز کیا اور سلطان قطب شاہ[2] (ہمعصر شاہجہاں) نے اس میں غزلیں تک کہیں اور اخیر میں ابوالحسن تانا شاہ[3] نے قید خانہ میں بیٹھ کر اپنے جذبات نظم ہی کے پیرائے میں نکالے!

آل تیمور کے دانت دکھن پہ مدت سے تھے اکبر نے ادھر مہم بھیجی اور پھر خود چڑھا۔ جہانگیر و شاہجہاں کے عہد تک یہ سلسلہ جاری رہا اور عالمگیر نے اس پرانے ارادہ کو تکمیل تک پہنچایا۔ ابوالحسن (تانا شاہ) کے ساتھ ہی ملک دکھن کا عروج بھی جاتا رہا۔ اور سلطنت گردی و زبان گردی ساتھ ساتھ ہوگئی۔ دکھنی شعرا جن کی سلطنت کے دسترخوان پر جگہ تھی بھوکھوں مرنے لگے اور آخر تتر بتر ہوگئے! بعض ان میں کے دلی پہنچے اور بعضوں نے بنگالہ کی راہ اختیار کی اور مرشد آباد پہنچکر مسند نظامت سے جا لگے!

---

[1] دکھنی اردو کے شعرا بے حساب ہیں مگر یہ بہت مشہور ہوئے ابجدی صاحب دیوان انکی زبان اس وقت کی شاہجہانی اردو سے بہت ملتی ہوئی تھی (تاسی) فتح علی صاحب تذکرہ فتح علی شاہ فضل دکھنی افضل الدین خاں صاحب مثنوی راجہ رام ادائی صاحب پھول بن و طوطی نامہ یہ تصنیف سلطان عبداللہ قطب شاہ عہد شاہجہاں کے نام پر معنون ہوئی قطب شاہ دکھنی صاحب مثنوی رسول اکرم ۱۰۱۸ھ (زمانہ جہانگیر) میں تصنیف ہوئی۔ دیدار صاحب مثنوی در حالات ماہ منور (سوداگر بچہ ہو) مثنوی تمثال د بانو۔ دختر فرنگ۔ [2] سلطان قطب شاہ والی حیدرآباد (۱۵۸۲ء عہد اکبر) صاحب دیوان تھا۔ اس کا دیوان کتب خانہ ٹیپو سلطان میں موجود تھا (تاسی) [3] تانا شاہ کا ٹھیٹھ دکھنی میں ایک شعر مشہور چلا آتا ہے جو اس نے قید خانہ میں کہا ہے

کس رکھوں جاؤں کہاں مجھ دل پہ پھل جھڑاٹے ہے
اس بات کے ہونگے سجن یاں دل ہی بارہ باٹ ہے

یعنی اپنی حالت آخر کہیں تو کس سے کوئی سننے والا نہیں اور پھر غم کی سل چھاتی پر اور دل ڈھیلے کی طرح ٹھوکروں میں مارا مارا پھرتا ہے (دیکھو تذکرہ گلشن ہند از لطف)

اردو اپنے گھر میں

حق کہا ہے ابن مریم نے کہ پیغمبر ذلیل نہیں ہوتا مگر اپنے گھر میں! یہی حال اس اردو کا دلی میں ہوا۔ ایک عرصہ سے روزمرہ تو یہی تھا مگر وقت پر وہ لاوارث بچہ کی طرح پرے ڈال دی جاتی اور کوئی منھ نہیں لگاتا۔ عالمگیر کے بعد مدت تک یہی بے تعلقی رہی مگر خدا بھلا کرے دکھنیوں اور خصوصاً دکھنی شہزادوں کا کہ جب انہیں بہادر شاہ[1] کے دربار میں جگہ ملی اور شہر میں پھیلے تو انکی بدولت یہاں اردو کے بخت بھی جاگے۔ دکھنی اپنا ادب ساتھ لائے تھے دلی والے اپنے بچہ کو غیروں کی گود میں اس طرح دیکھکر شرمائے اور پھر متوجہ ہوئے تو حق پدری ادا کرنے لگے اور مرزا عبدالقادر بیدل اور میر جعفر زٹل[2] (جنہوں نے دکھن کی ہوا بھی کھائی تھی اور اعظم و معظم کے متوسلین میں سے تھے) پرانی صف سے دو قدم آگے بڑھے اور اس طفل سے مخاطب ہوئے

---

[1] سکندر عادل شاہ بیجاپوری و قطب شاہ (گولکنڈہ) کو بہادر شاہ نے اپنوں کی طرح رکھا اور ان کے وجود سے دلی پر بہت اثر پڑا۔ امراء و متوسلین دکھن بھی ان سلطانوں کے ساتھ آئے اور دلی میں انکی ایک چھوٹی سی بستی ہی الگ بس گئی اردو میں پورچوگیز الفاظ انہیں دکھنیوں کے ذریعہ سے آئے وہاں یہ قوم بس چکی تھی اور دکھنی انکی لفظیں قبول کر چکے تھے [2] بعض تذکروں میں مُل کو زٹل کہہ کر اڑا دیا گیا ہے۔ مگر یہ انکی کم بینی ہے اردو کو صرف غزلوں کے اندر محدود سمجھنا نادانی ہے۔ زبان کی وسعت تو کچھ اور چاہ رہی ہے اور یہاں ابتک غزلوں ہی کے کوچے میں پھیرے لگائے جا رہے ہیں! بہرکیف یہ میر جعفر ہی ہیں جنہوں نے ان اطراف میں زبان کو وسعت دی۔ اردو نظم اور متعدد قطعات کہے۔ عالمگیر کا اردو میں ایک مرثیہ کہا۔ اپنے شہر آشوب میں اسوقت کی حالت اور بھائیوں (اعظم و معظم و بہادر شاہ) کی جنگ کا نقشہ کھینچا ہے چند شعر ملاحظہ ہوں۔ عالمگیر کو یاد کرکے کہتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۷۴ پر)

لیکن اب تک جو کچھ ہوا وہ فقط وقت گزاری اور دل بہلاؤ تھا۔ اور یہ شرف محمد شاہ ہی کے لیئے اٹھا رکھا گیا تھا کہ یہ نونہال اسی کے زیر سایہ پلے اور شاہجہاں کی یادگاریوں میں پھولے اور پھلے!!

طفل اُردو کا مکتب

بہادر شاہ کے وقت تک اردو کا ریختہ پختہ نہوا تھا مگر جب کہ بیدل[1] نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۳)

کہاں پائے اب ایسا شاہنشاہ — مکمل، اکمل، و کامل دل آگاہ
رکت کی انجھواں جگ رووتا ہے — نہ میٹھی نیند کوئی سووتا ہے
فلک رقاص بازی آنچناں کرد — زہر کس از خلل نقل مکاں کرد
دوادو ہر طرف بھاجڑ پڑی ہے — جدھر دیکھو تدھر بھاگڑ پڑی ہے
ازاں سو اعظم وزیں سو معظم — زمیں کے واسطے لڑتے ہیں باہم
بیا جعفر زباں را مختصر کن — زدور مختلف در دل حذر کن

انہوں نے فرخ سیر کی تخت نشینی پر ایک تمسخرانہ قطعہ لکھا اور سخت معتوب ہوئے ۱۱۲۵ھ تک جیتے تھے (دیکھو اڈنبرا یونیورسٹی میں زٹل کا سرمایہ) [1] مرزا عبد القادر بیدل وہ صاحب کمال ہیں جنکی نظیر دنیا میں جلد نہیں ملتی یہ محمد اعظم شاہ کے ساتھ مدتوں دکھن میں بھی رہے اور اسوقت کے کل امراء انکا ادب و لحاظ کرتے تھے اور انکی شاگردی کا دم بھرتے تھے آخر میں نظام الملک آصفجاہ کے سے امیر نے بکمال خلوص انہیں دکھن طلب کیا مگر یہ شعر جواب میں عرض کر بھیجا اور خود نہیں گئے ؎

دنیا اگر دہند نہ جنبم ز جائے خویش — من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

امیر الامرا سید حسین علیخاں کے ساتھ انکے ربط و ضبط کی حکایتیں مشہور عام ہیں انکے کمال پر نظر کر کے نواب نے ایکمرتبہ تین لاکھ روپیئے ان کے گھر بھجوایا لیکن قناعت کے گھر میں اسکی گنجایش نہ دیکھکر بصد شکریہ واپس کر دیا اور ان اطراف کے باکمالوں میں مرزا وہ پہلے ذی کمال ہیں جنہوں نے اردو کیطرف بھی توجہ کی اور اسے دکھن اور زمانہ کا اثر کہنا چاہیئے فرماتے ہیں ؎ مت پوچھ دل کی باتیں بیدل کہاں ہے ہم میں ٭ اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں ٭ جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا ٭ پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں (مرزا نے ۱۱۳۳ھ میں قضا کی)

ادھر دل دیا تو وہ اُمرا جو انکی شاگردی کا دم بھرتے تھے اور انہیں بزرگ مانتے تھے اِس زبان کو بھی اپنی محفل و مجلس میں جگہ دیکر حق شاگردی ادا کرنے لگے! بے خبر جو چاہیں کہیں مگر اردو بادشاہوں جہارا جوں اور ہمارے امراو کی گود میں پل کر جوان ہوئی اور قلعوں محلوں کی ہوا کھا کر باہر نکلی ہے اور آج بھی انہیں شاہی متوسلین اور پرانے گھروں کے سوا اُس کا صحیح ٹھکانا کہیں اور نہیں مل سکتا۔

یہ دلی کے امرا ہی تھے کہ جنہوں نے اس چونچال بچہ کے سر پہ ہاتھ رکھا اور اپنی توجہ کا شیر پلا پلا کر اُسے پال نکالا ان ہی امرا میں سے فرخ سیر کے زمانہ میں ایک امیر باتدبیر تھا جسے تاریخی زبان عمدۃ الملک اور عوام محمد امیر خاں کہتی اور انجمن شعرا انجام کے لقب سے یاد کرتی ہے یہ نواب بھی بیدل ہی کا دلدادہ و مقلد تھا اور جس وقت استاد اردو کی طرف مخاطب ہوا تو مودب شاگرد بھی ہمہ تن اُدھر متوجہ ہو گیا! انکی اس توجہ و خیال سے اس زبان کا وہ آوازہ بلند ہوا کہ ساری دلی گونج اٹھی اور پھر تو گھر گھر سے اسی کی صدا آنے لگی۔

نواب عمدۃ الملک[1] جیسا کہ پرانے تذکرے اور تاریخیں شاہد ہیں نہ صرف عربی و فارسی کا ماہر و اُستاد تھا بلکہ اُس کی سنسکرت اور بھاشا دانی کا بھی زمانہ

---

[1] عمدۃ الملک کی یہ دو غزلیں شاہد ہیں کہ وہ مجتہد زبان و فن ہے اور کسی کا مقلد کیا سب اسی کے شاگرد و زلہ خوار ہیں ؎

کیوں بلایا پھر ہمیں مجھسے یہ نادانی ہوئی
دختر رز بزم میں آ، شرم سے پانی ہوئی

گل محیط عشق کے صدموں سے پانی تھی نجات
کشتیٔ دل بیطرح کچھ آج طوفانی ہوئی

ہر پری تمثال جوں آئینہ رکھتا تھا عزیز
ٹوٹتے ہی دل کے مجھکو سخت حیرانی ہوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۶ پر ملاحظہ ہو)

قائل تھا ان کے دوہے اور کبت عرصہ تک دلی کے گلی کوچوں میں پڑھے اور گائے جاتے رہے۔ اردو کی طرف توجہ کی تو نہ صرف خود شاعر بنے بلکہ دنیا کو شاعر بنا چھوڑا اور عالمانہ شوقوں کے ساتھ نواب نے اس زبان کی ترقی کے لئے اپنی نگرانی میں ایک "انجمن" بھی قائم کی جس میں وقت کے فضلاء و زبان دان شریک ہوتے الفاظ و محاورات پر بحث ہوتی اور بڑے رگڑے جھگڑوں اور چھان بین کے بعد اس انجمن کے دفتر میں وہ تحقیق شدہ الفاظ و محاورات درج ہوتے اور پھر سارے ہند میں اس کی نقل بھیجدی جاتی اور دیگر امراء اسی امیر کی تقلید کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٧٥)

نعش میری دیکھ کے مقتل میں یوں کہنے لگے
کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی

کیا کہوں انجام میں اس عشق کے آغاز کو
دوستداروں کی محبت دشمنِ جانی ہوئی

دوم

ٹک تو فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

منہ ترا تکتے ہیں سب اقلیم حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم

دل تو ہے داغِ غلامی سے تری طاؤس وار
سامنے قمری کے گو ہیں سرو سا آزاد ہم

اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا
عمر مانندِ شرر جب کر چلے برباد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاسِ تمکنت
شکر ہے تڑپے نہ زیرِ خنجرِ فولاد ہم

افسوس کہ محمد شاہ کے ہاتھ سے نواب کا انجام بخیر نہ ہوا کہتے ہیں کہ شاہی اشارے سے دیوان خاص میں سنہ ۱۱۵۹ء شہید کئے گئے ان کے گھر کی ضبطی ہوئی اور دیگر اثاثات البیت کے ساتھ ان کا نادر کتب خانہ بھی برباد ہوا اور یوں ان کا کلام بھی تلف ہو گیا۔

ع ذرا زبان کو دیکھنا، یہ دو سو برس کی اردو ہے۔ میاں ولی کیا کسی ولی نے یہ زبان کی کرامت نہیں دکھائی۔

فخر جانتے اسی دفتر و انجمن میں حاتم و ضاحک[1] بھی تھے جنکی زباندانی کے آخر سکے بیٹھے!

اسی دفتر و انجمن کو یاد کر کے میر انیس اردو کو اپنے گھر کی زبان کہتے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔ ورنہ دلی جب بھی اور انیس کے وقت میں بھی زباندانوں سے خالی نہ تھی مگر ہر اک اس اسکول کا تعلیم یافتہ نہ تھا اور جب دلی کے بعد فیض آباد میں سالار جنگیوں کے شوق نے اس دفتر کو پھر قائم کیا تو ضاحک و میر حسن کو اس سے خاص تعلق رہا اور یہی سبب ہے کہ حسن کے گھر کے سوا اس زبان کا حسن کہیں اور اس طرح جلوہ نہ دے سکا۔

اسی عمدۃ الملکی انجمن کا یہ اثر و آوازہ تھا کہ دلدادگان مذاق و شیفتگان شاعری دور دور سے اس طرف کھنیچ آئے اور آخر میاں ولی[2] بھی دکھن سے اپنا دیوان بغل میں دبائے کھوٹے اور کھرے کی شناخت کے لئے اسی ٹکسال گھر سے آلگے!

---

[1] حاتم کا نواب کے یہاں تعلق تو مشہور ہے مگر ضاحک کے تعلق کو بہت کم لوگ جانتے ہیں یہ روایت سینہ بہ سینہ اور اپنے بزرگوں سے ہم تک پہنچی ہے ضاحک سنہ ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۱۹۰ھ میں مرے (دیکھو آسی) اور اس حساب سے وہ محمد شاہ کے عہد میں جوان کیسے ادھیڑ تھے اور عمدۃ الملک کی سرکار میں رہکر پورے زباندان بنے جب نواب کا کارخانہ بگڑا تو سالار جنگیوں اور صفدر جنگیوں نے اسے تھما اور مدتوں فیض آباد میں یہ زباندانی کا اسکول قائم رہا، ضاحک و میر حسن اور خلیق تک کو ان سے سرکار سے واسطہ رہا۔ انیس کی عمر کا ایک اچھا حصہ ان ہی محل میں (جو زبان کا ٹکسال گھر تھا) گذرا اور اس سے انکی تیغ زبان میں وہ جوہر آشکارا ہوئے جو ان کے گھرانوں کے سوا اور کہیں دکھائی نہیں دیسکتے۔

[2] ولی سنہ ۱۲ جلوس محمد شاہی میں دلی آئے یعنی جبکہ بیدل مرچکے اور زباندانی و شاعری کا چرچا وہاں عام ہوچکا تھا عمدۃ الملک (شاگرد بیدل) بھی اس وقت جوان اور اپنی زباندانی و شاعری کا سکہ بٹھا چکے تھے۔ تمیز ولی ہی کو اردو کا باوا آدم کہنا اور دکھنی اردو کو ٹکسالی اردو کے بالمقابل سمجھنا کسقدر کم بینی و کم علمی کی نشانی ہے انجام سو ولی کی زبان شاعری ہی کو ملا کر دیکھ لو صاحب۔ مذاق کبھی ولی کو ان پر ترجیح نہیں دیسکتا دلی کے ایک ہمعصر میاں حیدری مرثیہ گو بھی ہیں اور تعجب سے خالی نہیں انکا روزمرہ بھی دلی سے کہیں بہتر ہے۔

اس انجمن کا وزن و اعتبار روز بروز بڑھتا چلا اور آخر سلطنت نے بھی اس کا سکہ مانا اور محمد شاہ نے ان ہی محمد امیر خاں کو عمدۃ الملک اور اپنا نائب بنا کر اس اردو کے چلن کو عام گردانا!

شاہ عالم[1] اور اردو

دلی کے اجڑنے اور لٹنے پر اردو بھی لٹتی۔ مگر یہ بڑی سخت جان نکلی۔ قلعہ ابھی خالی نہ ہوا تھا اور یہ قلعہ والی سر جھکائے وہاں بیٹھی رہی اپنی حیثیت کے ساتھ شاہ عالم نے اسے بھی سنبھالا اور بزرگوں کی اس نشانی کو سینہ سے لگایا بادشاہ شاعر اور اس زمین کا آفتاب تھا ذرے دامن دولت سے لپٹے اور پھر چمکنے لگے۔ ملکی زبان بڑھنے اور رعایا دعا دینے لگی جب سے تخت اور اسکی کرسی ساتھی بچھتی اور

---

[1] شاہ عالم کا تخلص آفتاب تھا۔ غزلوں کے چار دیوان بادشاہ نے چھوڑے۔ اغلام قادر کور نمک نقد نظر بھی لوٹ چکا تو بادشاہ نے عجیب دردناک مرثیہ کہا کہتے کہتے کہتے ہیں۔

چہ حادثہ برخاست پے خواری ما ۔۔۔ داد برباد سر و برگ جہانداری ما

چشم من کندہ شد از جور فلک بہتر شد ۔۔۔ کہ نہ بینم کہ کند غیر جہانداری ما

داد افغاں بچہ شوکت شاہی برباد ۔۔۔ کیست جز ذات خدائے کہ کند یاری ما

شیر دادیم بہ افعی بچہ پروردیم ۔۔۔ عاقبت گشت بہ جور پے خواری ما

گل محمد کہ زمرداں بہ شرارت کم نیست ۔۔۔ چہ قدر کرد وکالت بہ گرفتاری ما

ہم الہ یار و سلیمان و بدل بیگ لعیں ۔۔۔ ہر سہ بستند کمر بہر دل آزاری ما

مادھو جی سیندھیا فرزند جگر بند من ۔۔۔ ہست مصروف تلافی ستمگاری ما

آصف الدولہ و انگریز کہ دلسوز من اند ۔۔۔ چہ عجب کہ بہ نمایند مددگاری ما

آخر وہاں بدبخت بہادر شاہ اور یہاں (لکھنؤ) بدنصیب اختر[1] شاہ تک تخت و کرسی کا یہ جوڑ برابر قائم رہا۔

نادرُ الوجُود اتحاد

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے — جانے نجانے تو ہی نجانے باغ تو سارا جانے ہے

باغ ہند کی چار ہزار سالہ تاریخ آج پیش نظر ہے اور دو مختلف قوموں کے اتحاد کی حکایت انہیں دو بولوں میں جلوہ گر ہے! آگے تشریح بے مزہ اور ذہن و دماغ پر بار ہوگی۔ خالی اتنا پڑھ لو کہ یہاں کے اصلی باغبانوں نے اپنے چمن کے اس گل کو کس طرح طرۂ دستار بنایا اور اپنی پگڑیوں کو کیونکر اس سے سجایا! لو سنو! احمد شاہ کے عہد سے لیکر نئی سلطنت ۱۷۱۹ء سے ۱۸۰۰ء تک کا یہ نمونہ مگر نمونہ از خروارے ہے)

(۲) آرام۔ پریم ناتھ خوشنویس بھی تھے۔ پرگو ایسے کہ انتخاب کرنے پر بھی دیوان دو ہزار شعروں پر ختم ہوا ؎

---

[1] واجد علی شاہ اختر کو ناواقف دنیا تو عجب طرح سے یاد کرتی ہے مگر جاننے والے ہی انکی قدر و ثنا کر سکتے ہیں۔ انکے علم فضل اور دماغی قابلیت کو دیکھنا ہو تو ان کے تصانیف کو دیکھو۔ قریب پچاس کتابوں (نظم و نثر) کے لکھ کر ڈال گئے مرثیے اور غزلیں سکے علاوہ ہیں! زبان شاعری کا مذاق اسی سلسلہ سے یہاں تک پہنچا جس سلسلہ میں بہو بیگم اور آصف الدولہ کے زباندان موجود تھے۔ اختر کا ایک مطلع نہیں بھولنا فرماتے ہیں ؎

ایک حسرت طور پہ بھی بہر موسیٰ رہ گئی — ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو تمنا رہ گئی

نورتن کے جواب میں سلطان عالم نے اپنے یہاں سبع سیارہ قائم کیا تھا اور اس سے ان کا مذاق ثابت ہوتا ہے۔ یہ سیارے لکھنؤ سے مٹیا برج کلکتہ تک اپنے اختر کے ساتھ ساتھ رہے اور راجہ گنگا پرشاد کے سے دریائے معانی بھی اسی ہفت رتن کے ایک گوہر نایاب ہیں!

خون آنکھوں سے نکلتا ہی رہا دل کا فوارہ اچھلتا ہی رہا
کون غمخواری کرے آرام کی ایک مجنوں تھا سو جلتا ہی رہا

آرام - لکھمن لال انشا دے سے ان کا بڑا یارانہ تھا ے

ہمدمو مجھ سے یہ کہتے ہو نہ تو یار سے مل اسکو سمجھاؤ ذرا یہ کہ نہ اغیار سے مل

اخگر - دیوان شک چند - مرزا خرم فرزند جہاندار شاہ کے متوسلین میں سے تھے ؎

کون کہتا ہے کہ ہم نے مے پرستی چھوڑ دی راتدن پیتے ہیں مے، پر مے پرستی چھوڑ دی

اسد - رائے سنگھ ے

چشم کو حال سے عاشق کے یہ بیہوشی ہے دل جو حیراں ہے تو یاں سرمۂ خاموشی ہے

امانت - امانت رائے ے

تشریف یاں نہ لاؤ پر نامہ بر تو بھیجو مت لو خبر ہماری اپنی خبر تو بھیجو

(ب) برق لالہ بھگوانند ے

مجھے بھی ہٹ ہوئی ایسی کہ مرمٹا لیکن نہ تیرے کوچہ سے ہرگز قدم اٹھا میرا

بسمل - منا لال ے

غیر کے کہنے پہ تم مجھ پہ نہ بیداد کرو بندگی برسوں کی اک دم میں نہ برباد کرو

بہادر - بہادر سنگھ ہمعصر شاہ حاتم ے

بلا دلا نظر آتا ہے کچھ گل رخسار رہا ہے کس کے گلے کا تو ہار ساری رات
ادھر تو مسکی ہے چولی ادھر کھلے ہیں بند نجانے کس نے یہ لوٹی بہار ساری رات

بہار - منشی ٹیک چند - صاحب بہار عجم - مشہور و معروف مصنف

وہی اک ریسماں ہے جسکو ہم تم تار کہتے ہیں کہیں تسبیح کا دانہ کہیں زنار کہتے ہیں

بیتاب - سنتھوک رائے شاگرد قائم ؎

نہ رہے باغ جہاں میں کبھی آرام سے ہم
پھنس گئے قید قفس میں جو چھٹے دام سے ہم

اپنے مذہب میں ہے اک شرط طریق اخلاص
کچھ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے ہم

بیجان - شیو سنگھ دہلوی ۱۸۶۵ء میں سرگ باشی ہوئے۔

بیجان میں جان تک بھی دی پر
میرا نہ ہوا وہ شوخ دلبر

بیخود - لالہ نرائن داس شاگرد - درد ؎

بنایا ہے الٰہی کیا دل بیتاب آتش کا
سرشک گرم ہے میرے بہا سیلاب آتش کا

(پ) **پروانہ** - راجہ جسونت سنگھ (خلف مہاراجہ بینی بہادر) نواب شجاع الدولہ (بنگالہ) کے مصاحبین خاص میں سے تھے ؎

تڑپتے جو دیکھیں ہیں لاشیں تو دل اب
ترے کوچہ کو کربلا جانتا ہے

(ت) **تسکین** - پنڈت گنگا داس ؎

ناصح یہ نصیحت اب تم کرتے ہو کیا بیٹھے
جو ہوئے سو ہو بہتر - دل اس سے لگا بیٹھے

کیا غم ہے ہمیں تسکیں آفات زمانہ سے
اب ہم شہ مرداں کے دامن تلے آ بیٹھے

تسلی - ٹیکارام - ساکن اٹاوہ - شاگرد مصحفی ؎

میاں جو کچھ ترے سج دھج میں مرزائی نکلتی ہے
کہاں مرزا مزا جوں میں یہ رعنائی نکلتی ہے

(ج) **جھمن** - جھمن لال - امیر الامراء ضابطہ خاں کی سرکار سے انہیں توسل تھا بہار دانش کو اردو نظم کا خلعت پہنا گئے ؎

دل جو سینہ عشق کی آتش سے جل گیا
اک آہ کھینچتے ہی مرا دم نکل گیا

(ح) حضور۔ لالہ بال مکند۔ شاگرد۔ درد سے

جفا کو تم وفا سمجھے ستم کو ہم کرم سمجھے　　اُدھر کچھ دل میں تم سمجھے اِدھر کچھ دل میں ہم سمجھے

(د) دل۔ بینی پرشاد عظیم آبادی سے

پردہ اٹھا کے تو نے ادھر کو گذر کیا　　عالم کے دل میں تیری محبت نے گھر کیا

دیوانہ۔ سرپ سنگھ۔ غزل گوئی میں استاد تسلیم کئے گئے لطف (گلشن ہند میں) لکھتے ہیں کہ مرزا جعفر علی حسرت اور میر حیدر علی حیران اُن کے تلامذہ میں سے تھے ۱۲۰۱ھ میں قضا کی سوا ہزار اشعار کا دیوان چھوڑا ہے سے

رباعی

وہ لوگ کہاں کے یار باتیں کیجے　　وہ وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجے

ایک گوشہ میں بیٹھکر دیوانہ تنہا　　اب ناخن غم سے دل خراشی کیجے

دل۔ دیبی پرشاد۔ مرشد آبادی سے

امید وصل اس سے عبث تو رکھے ہے دل　　جس سے کہ رسم نامہ و پیغام بھی نہ ہو

دلخوش۔ بہادر سنگھ۔ امرائے محمد شاہی میں سے تھے سے

ہوں ترے ہجر میں جوں دیدۂ نرگس حیراں　　چشم پوشی نہ کر آ اپنے گنہگار سے مل

(ذ) ذرہ مرزا راجہ رام ناتھ۔ مصاحب خاص شاہ عالم بادشاہ۔ شاہ عالم کے آفتاب کے سامنے ذرہ بنکر اپنے خلوص و وفاداری کو چمکایا کئے۔ مجالس کے بڑے دلدادہ۔ تعزیہ رکھتے اور محرم میں سبز پوش رہتے تھے۔ اللہ رے اس زمانہ کا ہندو مسلم اتحاد سے

غضب ہے آ کے عاشق کو لٹا دیتی ہیں یہ لال آنکھیں　　چھپا لیتی ہیں میری جان وہ کافر چھپال آنکھیں

ذرہ - لالہ جینی داس - دلی میں ان کا مکتب مشہور تھا - ہندو مسلمان سب ساتھ پڑھتے اور دونوں مل کر فیض اٹھاتے - بڑے خدا رسیدہ اور مرنج و مرنجان تھے۔ سچ کہتے ہیں ؎

کام عاجزوں کے کردو نیکی کے تخم بولو — آبِ رواں جہاں ہے کچھ ہاتھ اپنے دھولو

ذکا - خوب چندر (دہلوی) ؎

نقشِ پا خالقِ گیتی نے بنایا ہم کو — جس کے قدموں سے لگے اس نے مٹایا ہم کو

(ر) راجہ - راجہ بہادر خلف راجہ شتاب رائے دیوان ناظم بنگالہ وصوبہ دار عظیم آباد پٹنہ ؎

یہ زخمِ دل ہمارے مرہم تلک نہ پہنچے — دم ہم تلک نہ پہنچا ہم دم تلک نہ پہنچے

راجہ - راجہ رام پنڈت - ریختی ہمعصر رنگین ؎

جن دنوں تم نے محبت کا دیا تھا پیغام — مجکو معلوم جو ہوتا یہ ستانا صاحب
تو تو میں بخت جلی آتی نہ تم پاس کبھو — خیر اللہ کو یہ بھی تھا دکھانا صاحب

راجہ - بینی بہادر (بنگال) ؎

سیاہی منھ کی گئی دل کی آرزو نہ گئی — ہمارے جامۂ کہنہ سے مے کی بو نہ گئی

رسوا - آفتاب رائے - رسوا محمد شاہ کے سلح خانہ میں نوکر تھے۔

رسوا ہوا - خراب ہوا - دربدر ہوا — اس عاشقی کے پنتھ (طریقت ۱۲) میں جس کا گذر ہوا

رنگین - پورن لال دہلوی ؎

رنگیں نہیں ہیں قطرۂ شبنم یہ باغ میں — بادِ صبا نے مے سے بھرا ہے ایاغِ گل

(س) سخنور - لالہ دیوان سنگھ خلف رائے جے سنگھ ؎

گریاں یکھے ہے بن ترے یہ چشم تر مجھے　　طوفان نوح آئے ہے اب پھر نظر مجھے
ہوتی عیاں ہے صورت ہستی و نیستی　　جوں نقش پا ہمیشہ سرِ رہ گذر مجھے

سرشار - لالہ تلوک چند (متقدمین میں سے ہیں) ے

مارا ہوا اس ابروئے خمدار کا سرشار　　پانی بھی نہ مانگے کبھی وہیں پڑا پھڑکے

(ش) شاد - رائے لال سکندر آبادی۔

اُس رنگ چنپئی کا پڑا حسن زمیں پہ عکس　　چنپا کے پھول اُگتے ہیں اس سے بہاریں

شاداب - خوش وقت رائے چاندپوری ہمعصر قائم۔

جب تلک ہو کام تیر مژگاں سے تو ابرو مت چڑھا　　تیر کے ہوتے کوئی کھینچے بھی ہے تلوار کو

شعلہ - پنڈت امرناتھ۔

مجھے نہ سیماب مہوس نہ طلا زرگر کے ہم　　کیا سمجھ کر چرخ نے مجکو ملایا خاک میں

(ص) صبا کما نجھے لال - فیروزآبادی صاحب دیوان

چلے دامن اٹھا کے یہ کہو اس شوخ قاتل سے　　کہ یہ مدفن نظر آتا ہے رنگیں خون بسمل سے

(ض) ضمیر - گنگا داس

میں بتاتا ہوں ضمیر اب کچھ تجھے بھی ہے خیال　　یہ چشم خواب آلود اسکی فتنۂ بیدار ہے

(ع) عاشق، رام سنگھ کھتری۔

حیرت زدہ میں دیکھوں ہوں یوں اسکو بزم میں　　تصویر جیسے دیکھے ہے تصویر کی طرف

عزیز - بھاری لال

بات اب امتحاں پہ آئی ہے　　قصہ کوتاہ - جاں پہ آئی ہے

عزیز - مہاراج سنگھ

ضعف سے ہر رگ تن جسکی ہو تار بستر — کیونکہ بستر سے وہ بیمار اٹھے اور بیٹھے

عیاش ۔ خیالی رام ۔

جام ہے ہاتھ میں اور شیشۂ مے زیر بغل — نہیں عیاش کو اب بزم خرابات سے چھوٹ

(غ) **غافل** ۔ بختاور سنگھ

بیمار عشق کی نہ دوا ہو طبیب سے — مرجائے یا جیئے کوئی اپنے نصیب سے

غلام ۔ راجہ گوپال ناتھ ۔ خلف مرزا راجہ رام ناتھ ۔ ذرہ ، امیر و مقربین شاہ عالم میں سے تھے ۔ بادشاہ آفتاب تھے ۔ مرزا راجہ ذرہ بنے اور انہوں نے غلام بنکر حق نمک ادا کیا ۔

خط دے تو نہ دے گوش بر آواز ہیں قاصد — فردہ تو ہمیں یار کے آنے کا سنادے

(ف) **فارغ** ۔ مکند سنگھ شاگرد ۔ شاہ حاتم

دور سے دیکھ مجھے چیں بہ جبیں ہوتا ہے — تاکہ کچھ کہہ نہ سکوں بل بے رکھائی تری

(ق) **قلندر** ۔ لالہ بدھ سنگھ (ہمعصر خان آرزو)

جی کو سر زندگی نہیں ہے — کیا جی لگے کروں کہ جی نہیں ہے

(ک) **کامل** ۔ پنڈت ٹھاکر داس

پلٹ کر جو دیکھا سر راہ اس نے — لگا تیر اک بازگشتی جگر پر

(م) **مضطر** ۔ کنور سین ۔ انہوں نے واقعہ کربلا کو بھی نظم کیا اور منشی کریم الدین اس کے بڑے معرف ہیں !

خلل انداز وفا کون ساغماز ہوا — کہ جواب خط مضطر قلم انداز ہوا

سوز جگر کو دیدۂ پرنم کو دیکھئے — ان آفتوں کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے

مضطرب ۔ درگا پرشاد ۔

ترے وعدوں پہ اب ہے دم شماری
بہت اختر شماری کر چکے ہم

منشی ۔ مول چند ۔

خواہش نہیں کہ ہاتھ مرے سیم و زر لگے
یہ آرزو ہے سینہ سے وہ سیم بر لگے

منعم ۔ موہن لال

کہیں آیا ہے دلا آج قدِ یار نظر
کچھ قیامت کے ہیں آتے ہیں جو آثار نظر

موزوں ۔ چھتر سنگھ (نبیرۂ منشی مادھو رام صاحب انشائے مادھو رام)

بیت ابرو کو ترے دیکھ کے اے مطلعِ حسن
جو ترے کوچہ سے نکلا سو غزل خواں نکلا

(ن) **نادر** ۔ گنگا سنگھ ۔ شاگرد میر حسن

قاصد تو اِس بہانہ سے اُس پاس جائیو
یہ کس کا خط ہے مجھکو ذرا پڑھ سنائیو

نسیم ۔ مرزا راجہ کلاز ناتھ ۔ نبیرۂ راجہ رام ناتھ سرکار عالم شاہ میں عہدۂ نظارت پر مامور تھے ۔

قتل ہاتھوں سے ترے عاشق رنجور ہوا
درد سر روز کا تھا ۔ خوب ہوا دور ہوا

نشاط ۔ ایشور سنگھ خلف سندر داس (ہمعصر انشاد)

ہو اجازت تو ذرا لیجئے دم سایہ میں
تری دیوار کے آ پہنچے ہیں ہم سایہ میں

نظیر ۔ گنپت رائے شاگرد ۔ نصیر

کیا زرد ہوئیں عشق کے آزار سے آنکھیں
ہم چشم ہیں اب نرگس بیمار سے آنکھیں

ہندوستانی

(۱) مکنولال لاہوری نے علم بیان میں ایک رسالہ لکھا۔ پھر ایک تذکرہ تالیف کیا۔ گلدستۂ نشاط (انتخاب غزلیات) کے جامع بھی یہی ہیں۔

(۲) ماسٹر رام چندر (خلف رائے سندر لال و نبیرہ رائے ٹیک چند) نے جبر و مقابلہ اصول علم مثلث بالجبر، علم ہندسہ تراشہائے مخروطی حساب وجزئیات وکلیات میں رسائل تالیف کر کے ذخیرۂ اردو کو بڑھایا۔ عجائب روزگار بھی انہیں کی یادگار ہیں سے ہیں۔

(۳) بابو اجودھیا پرشاد نے علم مساحت و قوانین مستعملہ پر رسائل تالیف کئے اور ہرشل کی ہیئت کو اپنی زبان میں بھی سمجھا گئے!

(۴) بابو ہردیو سنگھ (خلف بابو بسنتی رام) علم پیمائش و اصول حساب کا دفتر اردو میں کھول گئے

(۵) پنڈت رام کشن نے فن ڈاکٹری کی اپنی زبان میں تشریح کی ان کے متعدد علمی رسائل ہیں۔ قانون اسلام و دھرم شاستر کو بھی انہیں نے ایک رشتہ میں منسلک کر دیا

(۶) بابو شبو نرائن طبعیات پر ایک رسالہ تالیف کر گئے ان کا ایک جغرافیہ ہند بھی مشہور ہے۔ ڈموستھی نس کی لائف بھی اردو میں بیان کی۔

(۷) بابو موتی لال اس کے بعد سسرد کے حالات زندگی لکھکر چھوڑ گئے

(۸) بابو دھوم نرائن نے تاریخ انگلستان لکھی اور اس زمانہ میں پولٹیکل اکانومی کے مشکل مسائل کو اردو میں بھی سلجھا گئے!

(۹) بابو گوبند سنگھ۔ پرانی دنیا کو نئی دنیا (امریکہ) کی خبر دے گئے۔

بنگالی

(۱) مہاراج، راج کرشنا بہادر مشہور و معروف مہاراجہ نبا کرشنا بہادر (میر منشی وارن ہیسٹنگز) کے خلف اکبر یہ وہی نبا کرشنا ہیں جن کا ذکر تاریخوں میں آتا ہے۔ لارڈ کلایو کے ساتھ بھی رہے اور شاہی دربار تک بھی آخر انکی رسائی ہوئی راج کرشنا اسی نامور باپ کے بیٹے ہیں۔ فارسی کے تو خیر ماہر اور مشہور بے بدل منشی تھے ہی۔ اس کے ساتھ اردو پر بھی اہل زبان کی طرح قدرت دکھادی معظم شاہ کا حال نظم اردو میں لکھا اور ایسا لکھا کہ اسوقت وہ مقبول خاص و عام ہوا۔ موسیو گارسن دی تاسی خبر دیتے ہیں کہ انکی یہ نظم ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) اور پیرس کے سرکاری کتب خانہ اور برلن کی یونیورسٹی لائبریری میں موجود تھی۔ انہوں نے غزلیں بے شمار کہیں۔ کلیات پانچ جلدوں میں تھا۔ اور ان کے فرزند راجہ کالی کرشنا اسے جان سے لگائے رہے۔

(۲) راجہ کالی کرشنا بہادر خلف راج کرشنا بہادر فارسی اردو کا شوق انہوں نے وراثت میں پایا یہ مشہور و معروف خاندان بنگالہ و کلکتہ میں ممتاز رہا اور سودا بزار راج فیمیلی کے نام سے ابتک جیتا ہے۔ کالی کرشنا ۱۸۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ مجموعہ لطائف اردو انہیں کی تالیفات میں سے ہے! گے کی (انگریزی) کی ایک نظم کو اردو میں نظم کرکے احسن المواعظ اس کا نام رکھا یہ پہلے شاعر ہیں۔ جنہوں نے انگریزی خزانہ سے اردو کو بھی فیض پہنچایا ان کا

ایک رسالہ ہئیت میں نظام شمسی کے نام سے مشہور ہے۔

(۳) راجہ رام موہن رائے بانیٔ فرقہ برہمو سماج اٹھارویں صدی کے مجددین میں سے ہیں (عظیم آباد پٹنہ) میں انہوں نے تعلیم پائی۔ یہ وہی رام موہن رائے ہیں جو آخری شاہ ہند کے ایلچی بنکر انکی دادرسی کے لئے ولایت گئے۔ اردو میں بھی انکی تصانیف کثرت سے ہیں موسیو گارسن دی تاسی پیرس میں ان سے ملا تھا وہ کہتا ہے کہ راجہ ہم سے اردو میں بھی خط و کتابت کرتے تھے۔ انہوں نے کلکتہ میں ایک اردو اخبار بھی نکالا اور عرصہ تک اس کے ایڈیٹر رہے!

اس داستان اتحاد کے دو اور برگزیدہ ہیرو ہیں جن کے ذکر خیر بغیر ہماری کتاب ختم نہیں ہو سکتی۔ ان میں اول ہمارے مرزا جھنولال طرب ہیں جو کچھ سوچکر اپنا طرب انگیز دیوان گھاگرا کے سپرد کر آئے اور پھر دلگیر بنکر مرثیے کہنے لگے! یہ مرزا جھنولال ہی ہیں جنہوں نے دو قوموں کی زبان کے ساتھ انکی معاشرت و مراسم کو بھی ایک کر دکھایا (حضرت) قاسم کے حال میں (حضرت) کبریٰ کی زبان یوں کھولتے ہیں۔

مجرے کو چچا کے قاسم جب بنڑا بنکر آیا — زینب نے کلیجہ پکڑا دل سرور کا بھر آیا
کبرا رو رو چلائی اب مجھ پر محشر آیا — بیتابی کی حالت میں یہ حرف زباں پر آیا

قاسم مرنے چلا، چھوڑ مجھے ناشاد
دادی زہرا پہنچے پوتی کی فریاد

اس بنڑے نے واں سب کو القصہ بلکتے چھوڑا — ماں سے بھی پھرائیں آنکھیں دلہن سے بھی منہ موڑا
تلوار کمر میں کسکر دوڑایا ڈپٹ کر گھوڑا — روبہ صفتوں کے آگے جوں شیر دلاور آیا

بیسری بولے دیکھو مرنے کو اِس آن
سر پہ باندھے سہرا آیا ایک جوان

آخر لعینوں نے جوانی ماٹی میں ملائی اسکی — کاٹی پہونچوں سے ہی ہیرا کلائی اسکی
گھوڑے سے گرا اور گھر میں آواز جو آئی اسکی — یوں روتا لاش پہ اسکی فرزند پیمبر آیا

قاسم دُلہن کو تیرے ٹھور ہو نہ بٹھاؤں
ماٹی میں یوں رل گیو بیر حسن کے ناؤں

گھوڑے پر لاشہ رکھ کر اس زخمی تیغ و سناں کا — خیمہ کی جانب رو رو شبیر نے گھوڑا ہانکا
سوہے چولے سے اُس دم بنڑی نے منہ اپنا ڈھانکا — دلہہ کا لاشہ جب دم خیمہ کے اندر آیا

ہاتھ کی چوڑی پھوڑ کے نوچے اپنے کیس
منہ کو دھور لپیٹ کے کیا فقیری بھیس

یہ سوہا چولا اور چوڑی عربی نہیں ہندی ہے اور عرب کی خوزادیاں بیوہ ہوتے پر وہ نہیں کرتیں۔ جیسے فرزا یہاں دکھا گئے مگر اب ہمارے اعلیٰ گھروں کا یہی دستور ہے اور ایسے سمجھ کر ہم نے اس کو قبول کر لیا اور دلگیر کے قائم کردہ اتحاد کو مان لیا!

ہمارا دوسرا ہیرو اور جوان صالح پنڈت شنکر دیال نسیم ہے! جس کے گلزار میں بھی ہوائے اتحاد یوں ہی چلا کی۔ سنو وہ کیا کہتا ہے ؎

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری — ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے اکثر — حمد حق و مدحت پیمبر
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے — یعنے کہ مطیع پنجتن ہے
ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی — کرتا ہے زباں کی پیش دستی

نسیم نے جب یہ حمد و نعت لکھی تو اس کا یہ ہر ہر ملا کو بھایا اور پیغمبر کی مدح اور پنجتن کی یوں اطاعت پر کسی پنڈت نے اسے مسلمان نہیں سمجھا اور ایسے پر آشوب زمانہ اور پُر از نخوت وقت میں چکبست نے بھی اسے ترک نہ جانا۔ یہ ہی وہ اردو جو اتحاد ہے جس کی نظیر اس ہند سے باہر تم نہیں پا سکتے۔ مگر یہ وہی اتحاد ہے جسے آج نئی تعلیم نے توڑا اور نئے دماغوں نے جس کا سر کچلا ہے۔

انگریز اور اردو

کہا گیا ہے کہ وَلِکُلِّ قومٍ وقتٍ! اور ہر قوم کے لئے ایک وقت ہی! اور جب ہمارا وقت بھی پورا ہو چکا تو اس باغ کی پاسبانی کے لئے قدرت نے اس دَور کی بہترین قوم کو چنا۔ یہ قوم تخت کیان کی آرزو میں نہیں بلکہ تخت طاؤس کی ہوس میں ادھر آئی اور بہت جلد گھل مل کر اور بے تکلف ہو کر اس گلزار کی سیر کرنے لگی۔!

انگریز گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر ادھر آئے اور دنیا کا تجربہ رکھتے تھے۔ زبان کی وہ دقتیں جو ان سے قبل کے سیاحوں کو پیش آئی تھیں وہ ان کے رستہ میں بھی حائل ہوئیں۔ لیکن صدیوں سے ایک نظام قائم اور درست ہو چکا تھا۔ سمجھ کر انہوں نے اسی کو ہاتھ میں لیا اور یوں اپنے جہانداروں کو خوش کرنے اور پرچانے لگے! یہ باغ قدرت نے انہیں بخشا تھا اور اس کے اس بڑے عطیہ کا لحاظ کر کے اسکی خدمت پر مستعد ہو گئے! جب سب طرف سے مطمئن ہو کر بیٹھے تو اپنے قیام اور اپنی قوم کے یہاں کے استحکام کی سبیل پر غور کرنے لگے۔ سوچنے والے

دماغوں نے سب سے پہلے اسی زبان کے مسئلہ کو سلجھانا چاہا جس کے حل ہوئے بغیر دو مختلف قومیں کبھی ایک اور دوست نہیں بن سکتیں!

اس فرزانہ قوم نے دیکھا کہ یہاں کی اصلی اور سرکاری زبان میں ابتک فرق اور مغائرت ہے۔ اسے اندیشہ ناک تصور کیا اور خوب سمجھا کہ جبکہ اس زمین پر کئی ہزار برس کی ریاضت پر بھی سنسکرت کا درخت جڑ پکڑ نہ سکا اور پھر صدیوں کی محنت پر بھی پالی کے پھول پھل نہ سکے تو پھر فارسی کبتک خزاں سے محفوظ رکھی جاسکتی ہے؟ اس لئے وہ اس زمین کی اصلی پیداوار (زبان) کی آبیاری کو اپنا فرض اور اس باغ کی بہترین خدمت سمجھنے لگے۔!

فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء

قلعہ معلیٰ کے بعد فورٹ ولیم اردو کا گھر اور عمدۃ الملکی اسکول کا نمونہ بنا برٹش گورنمنٹ مغلوں کی جائز نائب تھی جس طرح اگلی سلطنت نے اپنی رعایا کا خیال کر کے آخر انہیں انکی زبان عطا کی۔ اس گورنمنٹ نے بھی اسی طرح رعایا پروری کی مثال قائم کی، سرکاری حکم و خرچ سے فورٹ ولیم (کلکتہ) میں اردو کالج قائم ہوا اور ڈاکٹر جون گلکرسٹ کی نگرانی میں اس کا نام و کام چل نکلا۔ بکرماجیت و جہانگیر جی (اکبر) کے سنگاسن میں نورتن جڑے تھے مگر اس نئے تخت میں گیارہ رتن لگے اور جگمگائے۔ سید محمد بخش حیدری۔ میر بہادر علی حسینی، مرزا علی لطف، بابو نہال چند نہال، میرامن، حفیظ الدین، شیر علی افسوس، کاظم حسین جوان، مظہر علی ولا، اکرام علی اور لالو لال کوی کے سے منتخب جواہر اکٹھا کئے گئے اور سلطنت کے اقبال اور ان

گیارہ یاروں کی مدد سے اردو پھر بننے اور سنورنے لگی۔

صدیوں کے اتحاد کا زور یہاں اور بڑھا جوان نے شکنتلا (ناٹک) اور بکرماجیت کا حال لکھکر ملکی ہیروز کو زندہ کیا پھر دستور ہندی کی ترتیب سے یہاں کے رسموں کو جگایا اور بارہ ماسا میں اس باغ کے موسموں اور فصلوں کو بتایا۔ ولا نے بیتال پچیسی اور سنگاسن بتیسی کی دلچسپ کہانیاں سنائیں اور قصہ مادھولال کو اپنی زبان میں دہرایا سری لال کوہی نے پرانی بھاشا کے ذخیرہ کو اپنی نئی بھاشا (اردو) کے خزانہ میں جگہ دی۔ پریم ساگر سانے اور لطائف ہندی کے پھول کھلانے لگے! پھر راج نیتی میں کشن جی کا جنم پترا کھولکر اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی مستفیض کرنے لگے۔ یہاں چند خوش خوش دوڑے اور گل بکاؤلی توڑ لائے اور اردو دانوں کی آنکھیں بھی کھولدیں! انیس اپنے وقت میں اسی سبقت پر اشارہ کرتے اور رشک کھا کر بے اختیار کہتے ہیں ؎

ہر چند سنا گیا ہے اس کو — اردو کی زباں میں سخن گو
وہ نثر ہے دادِ نظم دوں میں — اس مے کو دو آتشہ کروں میں

یہ تھا اتحاد زبان اور اتحاد خیال اس عہد کا جسے اس سلطنت نے بھی فروغ دیا اور ڈاکٹر گلگرسٹ کے ساتھ کپتان ابراہیم لوکٹ اور فیسر ٹیلر نے بھی جس میں زور لگایا اور دلی کا مال (اردو) بنگالہ لیجا کر وہاں کے بزاروں میں اس طرح عام کر دیا گیا!

سرکاری زبان

دلی کی سلطنت مٹنے پر کسے معلوم تھا کہ اردو پھر یوں راج رہے گی،

اس نئی قوم نے واقعی امید سے زیادہ اور ہمارے حوصلوں سے بڑھکر ملکی زبان کو بڑھایا ایک فورٹ ولیم کالج ہی پر قناعت اور بس نہیں کی گئی بلکہ اس زبان کی وسعت و ہمہ گیری پر نظر کر کے اُسے سلطنت کی زبان بنانے اور شاہی اختیارات دینے کی فکر ہونے لگی۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز میں یہ مسئلہ پیش ہوکر اس کے ممبروں کو اپنی طرف مخاطب کرنے لگا۔ سرکار کمپنی کے ایک فاضل و زباں داں ممبر مسٹر رام کریو نے اس زبان کے متعلق اس وقت اپنی یہ رائے ظاہر کی!

"مسلمانوں کے قبضۂ ہندوستان سے قبل یہاں کا جو حال ہو مگر اب تو یہاں کی زبانوں کی حالت یہ ہے کہ نہ تو اُن کا ماخذ صرف سنسکرت ہی کہی جاسکتی ہے اور نہ وہ زبان صرف اُن کی اصل ہے۔ جو دیوناگری میں لکھی جاتی ہے اور یہی حالت اُن حروف کی ہے جس میں یہ زبانیں لکھی پڑھی جاتی ہیں! اردو کی اسوقت یہاں کی حالت بجنسہٖ فرنچ کی سی ہے کہ وہ تمام یورپ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس ایک اردو کے جان لینے سے ایک حصۂ ملک سے دوسرے حصۂ ملک تک بے تکلف آؤ جاؤ کسی معاون اور ترجمان کی ضرورت نہ ہوگی! یہ اردو۔ عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت کے میل سے بنی ہے اور فارسی خط میں بہ نسبت دیوناگری کے اس کا لکھا جانا زیادہ آسان اور بامعنی ہوتا ہے"! (دیکھو مراسلات صدر بورڈ آف ریونیو اور تجویزات مسٹر رام۔ کریو۔ صفحہ ۸ اخیر کالم)

یہ تھیں وہ صاف اور بے لاگ رائیں جنہوں نے سرکار کمپنی کے خیالات کو اور مضبوط کیا۔ اور آخر ۱۸۳۵ء میں سرکاری دفتر کی زبان اردو قرار پائی اور رعایا کے دلوں سے دعائیں نکلیں!!

مزید کوشش و ترقی

دلی کی اردو سوسائٹی

سرکاری توجہ و مہربانی سے ادھر بنگالہ کلکتہ میں اس زبان کا زور قائم ہو لیا تو اب اسی خیال نے اس زبان کے اصلی گھر کو یاد کیا اور ۱۸۴۳ء میں ڈاکٹر اسپرنگر کی زیر نگرانی دلی میں ایک اردو سوسائٹی بنائی گئی اور غدر تک یہ محکمہ قائم اور اردو کو بڑھاتا اور ملک کو فائدہ پہنچاتا رہا۔ منشی کریم الدین پانی پتی کے ساتھ پنڈت رام کشن پنڈت اجودھیا پرشاد، موتی لال دھرم نرائن، شیو نرائن، داتارام برہمن اور ہردیو سنگھ و رام چندر نے اپنی زبان کی خدمت کی اور ترجموں اور تالیفات و تصنیفات سے اردو کا خزانہ بھرتے رہے!!

اس وقت ممالک متحدہ میں بھی غیرت باقی تھی اور مسٹر ریڈ کی توجہ سے قمرالدین، چرونجی لال، بنسی دھر، سری لال اور موہن لال نے اپنی اردو کو فروغ دینے میں جانیں لڑائیں اور ہمارے مخدوم مالوی جی کے جنم لینے سے بہت قبل یعنی ۱۸۵۱ء تک آپ کے صوبہ میں بھی اس اردو کا بول بالا اور ہندو مسلم اتحاد کا پرچم چمکتا اور سرکاری التفات بدستور قائم رہا!!

سائنٹیفک سوسائٹی

ملکی زبان کی طرف مخاطبت اور ہمارے حکام کی اتنی جد و جہد کا نتیجہ یہ تھا کہ دو مختلف قوموں کی مغائرت اس سبیل سے دور کیجائے۔ انہوں نے اس ملک کی تاریخ پڑھی۔ اگلی سلطنتوں کی دقتوں کو جان چکے اور خوب سمجھتے تھے کہ یہ زمین

کسی غیر زبان کے بیج کو قبول کرنے والی نہیں۔ اور پھر تیس کروڑ مخلوق کو اپنی زبان (انگریزی) سکھانے سے زیادہ آسان اور سہل یہ ہے کہ ہم خود انکی زبان سیکھیں اور اور اسے قابو میں کر کے رعایا کے مطالب سمجھیں اور پوری دادرسی کر سکیں اور یوں حاکم و محکوم کا رشتہ اتحاد ہمیشہ کے لئے مضبوط ہو جائے! سرسیدؒ جو ایسے اتحاد کے دل سے حامی اور ہندوستان کے لئے اُسے ایک نعمت سمجھتے تھے اس مقصد کی انجام کی خاطر فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور راجہ جے کشن داس کی اعانت سے غازی پور و علیگڈھ میں انہوں نے ایک سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ یہ اکیڈیمی ۱۸۶۳ء میں قائم ہوئی اور مسٹر ولیمس کمشنر میرٹھ اور مسٹر بریلی کلکٹر ضلع کی ہمدردیوں اور امداد کی بدولت تین چار برس کے اندر اندر اتنی ترقی کر گئی کہ اس وقت کے کل زباندان اور علم دوست انگریز اس کے شریک ہوئے اور آخر ڈیوک آف آرگائل (وزیر ہند) بھی اسکی طرف مخاطب ہو کر سوسائٹی کے پیٹرن بنے! لوکل گورنمنٹ اور گورنمنٹ پنجاب نے اسکی حمایت و امداد کی اور گورنمنٹ آف انڈیا نے توجہ و سرگرمی دکھائی۔! تصنیف و تالیف کا رستہ کھلا اردو میں انگریزی سائنس اور علوم و فنون کے ترجمے شروع ہو گئے۔ منشی ذکاء اللہ ماسٹر پیارے لال اور پنڈت دھرم نرائن کے سے بزرگوں کے انہماک نے ملکی زبان کو مغربی علوم کے چشموں سے بھی سیراب کرنا اور اس پودے کو بڑھانا شروع کر دیا!

اس سوسائٹی کا مقصد محض تصنیف و تالیف ہی نہ تھا بلکہ اس نے اس ملک کے مرض کی اصلی دوا اور ہمارے درد کا صحیح درماں بھی ڈھونڈ نکالا! زمیداران ضلع علیگڈھ تعلیم کی طرف متوجہ کئے گئے اور انکی منظوری سے سوسائٹی نے ۱۸۶۷ء میں

تعلیمی ٹیکس کے اجرا کا رزولیوشن پاس کر کے اپنی عرضداشت گورنمنٹ آف انڈیا کی خدمت میں بھیجی۔

اس تیس چالیس برس کے اندر ملکی زبان سے حکام اتنے واقف ہو چکے تھے کہ ہمارے لٹریچر کو سمجھ سکیں اور اس سمجھ کی وجہ سے وہ ہمارے تمدن و معاشرت سے نابلد نہیں رہے تھے۔ زبان کی واقفیت حاکم و محکوم کے رشتۂ اتحاد کو مضبوط کر رہی اور ہماری انکی دوستی مستحکم ہو چلی اور وہ ہماری ضروریات کو بہ آسانی سمجھکر ہمارے ہمدرد ہو رہے تھے! اور انہیں اسباب کا یہ نتیجہ تھا کہ جب کہ ایسی درخواست حسب قاعدہ مسٹر ہنری لارنس کلکٹر ضلع علیگڈھ پاس پہنچی تو انہوں نے اسکی حمایت کی اور اپنی پرزور رائے کے ساتھ اُس گزارش کو گورنمنٹ تک پہنچایا اور آخر حضور وائسرائے نے بھی اس کے جواب میں اپنی خوشنودی ظاہر فرمائی!!

اس سوسائٹی کے کارکنوں نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ وہ ایک صحیح مقصد کی طرف آگے بڑھے اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن کو اپنا ہم آواز بنا کر اس ملک کی اصلی ضرورت کی طرف گورنمنٹ کو انہوں نے متوجہ کیا۔ اسی سن میں پھر ایک درخواست سرکار میں گئی جس میں اور گزارشوں کے ساتھ یہ دو دفعات بھی تھے!!

اول یہ کہ یہاں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں دیسی زبان میں تعلیم دی جا سکے!! اور دوسرے یہ کہ ایک اردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کی جائے اور ایک جدا یونیورسٹی ملکی زبان میں علیحدہ کھڑی کی جائے!

اب اس کے بعد کیا ہم کو اپنے اصلی ضروریات اور یہاں کے تعلیمی مسائل کو

بھر اور بار بار کہنے اور اس کے سلجھانے کی ضرورت ہے؟ ملک سے واقف اور ہمارے ضروریات سے آشنا بزرگوں نے آج سے پچاس برس قبل ہماری نکبت کو سمجھا اور اس کے دور کرنے کی فکر کی! یہ وہی طریقہ تعلیم ہے جس کے اجراء کے بغیر یہ ملک کبھی آگے بڑھ نہیں سکتا اور اسی پر نظر کر کے ایک یوریین کلرجی نے ہمارے فاضل بجنوری (ڈاکٹر عبدالرحمن) کو ٹوک کر کہا تھا کہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کئے بغیر یسوع کی قسم تم ہزار برس میں بھی ترقی نہیں کر سکتے!

رنگ میں بھنگ

حق کہا ہے امیرالمومنین نے کہ ان الزمان مفرق الاحباب آخر اسی ناہنجار زمانہ نے ہندوؤں، اور مسلمانوں کے بھائی چارے میں بھی خلل و افتراق ڈالا! یہ اردو جو ان دو قوموں کی متفقہ کوشش کا نتیجہ اور یہ زبان جو ان کے اتحاد کا بڑا سبب تھی، تفرقہ پردازوں نے اسے کمزور کرنا چاہا! صدیوں سے آپس میں ایک بے نظیر سمجھوتا ہو چکا تھا اور دونوں اس پر کاربند تھے مسلمانوں نے محبت و خلوص کے برقرار رکھنے اور دوستی کے قائم رہنے کی آرزو میں ایثار کی انتہا کر دی - اپنی اصلی زبان عربی، فارسی، ترکی کو ہمیشہ کے لئے انہوں نے بھلایا اور ملکی اپنے عزیز بھائیوں کی زبان کو بے تکلف یاد کر لیا! ہندوؤں نے اس کا لاجواب جواب دیا - اور آپس کی کشش کے قائم و دائم رہنے اور جذبات سرد نہ ہو جانے کی خاطر بلا پس و پیش انہوں نے اپنے ان بھائیوں کے وہ حروف اختیار کر لئے جو سامی عہد کے یادگار اور ایک قدیم قوم کو ایک دوسری پرانی

قوم سے ملانے والے اور دونوں کو ایک ہی صف و مسطر پر کھڑا کر کے دنیا کو یکجہتی کا سبق دے رہے تھے۔!

یہ حروف نہ صرف مختصر نویسی[1] کا ایک اعلیٰ نمونہ اور فن تحریر کے ارتقاد وایوولیوشن کی جامع و مختصر تاریخ اور پٹ مین کے معلم و ہادی ہی تھے بلکہ تاریخ زبان اردو کے وہ بہمثل مفسر و شارح بھی تھے کہ بیک نظر اُن کل الفاظ کو معہ انکی پوری شکل و شمائل اور صحیح آواز و معنی اور حسیت و درست لب ولہجہ کے عیاں و ظاہر کر سکیں جن کی آمیزش سے یہ زبان صدیوں کی کد و کاوش کے بعد آج شرفاء و نجباء کے منھ تک آنے کے قابل و لائق بنی اور اپنے گذشتہ کارناموں کو آپ بنا رہی ہے! ہندیوں نے جب ٹوڈرمل کی اسکیم کا استقبال کیا اور فارسی کو اپنا آلۂ زبان بنایا اُس وقت یہاں ایک نہیں دس طرح کے حروف رائج اور ایک دوسرے سے مختلف تھے ان نئے حروف نے پُرانے حروف کی فضول تفریق کو مٹا کر سب کو ایک بنایا اور پھر ایسی پیر یمیسی قائم کر دی کہ بکھرا ہوا ملک ایک ہی سرشتہ کے تحت میں آگیا اور جب ملکی زبان اُردو اختیار کی گئی تو دونوں جماعتوں نے ملکر ان ہی حروف کو سراہا اور اسکو آگے بڑھا دیا۔

ہمارے اگلے بزرگ فارسی، ان نئے حرفوں کے صدیوں سے عادی ہو رہے تھے اور بقول ہمارے مخدوم بابو نرندر ناتھ لا کے اُن کا طریقۂ تعلیم (اکبر کے وقت میں) یہ تھا کہ بچوں کو پہلے (فارسی) حروف تہجی سکھائے جاتے اس میں آٹھ دن سے زیادہ نہ لگتا۔ املا سکھانے پڑھانے میں دوسرے آٹھ روز صرف ہوتے ہے۔

[1] پٹمین شورٹ ہینڈ (مختصر نویسی) کا موجد سمجھا جاتا ہے۔

پھر جملے اور اخلاقی فقرات بتائے جاتے اور ایک ماہ کی اندر اندر (اس غیر زبان کو) لڑکا خود سب پڑھ لیتا (دیکھو پروموشن آف ٹریننگ ۔ صفحہ ۱۶۱) اور اس طرح انکی دقتیں سہل ہو چکی تھیں اس کے علاوہ واقعی ایک پراگندہ جماعت اور منتشر ملک کو اس آسان سبیل سے ایک اور متحد کر دینا چاہتے تھے اور جبکہ وہ ملکی زبان کے مالک و ماہر بنے تو اُس زبان کے سلطان ہی حروف کو بھی قائم کر گئے جو انکی تاریخ بتاتے اور اتنے بڑے اتحاد کو برقرار رکھنے والے تھے۔

ان دو قوموں کے ساتھ اب ایک تیسری قوم بھی ہماری شریک ہم سبق ہو چکی تھی اور ان انگریزوں کی ملک دانی ہوشیاری اور فیاضیوں نے اس اردو کے زور کو بڑھا کر معاشرت کو گھٹایا اور انہیں بھی ہم سے قریب تر کر دیا تھا۔ ملکی زبان جاننے اور اس آلہ سے رعایا کا دل اگر مین کر لینے سے ہمارے اتحاد کی بے نظیر مثال قائم ہو رہی اور اسی سے ان نئے مسافرین کا یہاں گھر بن رہا اور حاکم خوش محکوم بشاش یہ زمین گلزار اور یہ باغ تر و تازہ نظر آ رہا تھا کہ دفعتاً ایک باد مخالف ایسی چلی کہ اکی بہار آخر خزاں ہو کر رہی!

لارڈ مکالے کے مشہور ڈسپیچ نے ہماری قدیم زبانوں پر ایراد کیا اور ملک میں ایک نئی قسم کی تعلیم و تربیت جاری کرنے کے لئے انگریزی کے سوا اور کوئی رستہ سجھائی نہ دیا! ہم مکالے کی نیت پر کوئی حملہ نہیں کرتے ہم اُن کے مزاج اور انکے مشہور تلون سے بھی اچھی طرح واقف ہیں اور اکثر پہلو پر نظر کر کے واقعی ہم ان کے مشکور بھی ہیں۔ مگر انکی زباندانی اور اس ملک میں رہ کر یہاں کی زبان سے انکی واقفیت پر رشک کئے بغیر نہیں رہ سکتے!

خیر اسی ڈیسپیچ اور رائے نے خیالات پلٹے۔ انگریزی ابھری اور ملکی زبان (اردو) ڈوبنا شروع ہوئی! اور اس ستر برس میں جو کچھ نتیجہ ظاہر ہوا وہ آئینہ اور تعلیمی اسٹے ٹسٹیک کے صفحوں پر آپ عیاں ہے! اور جبکہ انڈین فیور میں صرف کونین اور ہندی معدوں کے لئے جبکہ خالی پپسین تجویز کر دیجائے تو ایسے معالجین کا کیا علاج!!

اس ناقص اور ہمارے مزاجوں سے مختلف دوا کے اثر کو ابھی ایک پشت بھی نہ گذری تھی کہ معدوں کی تبخیر دماغوں تک چڑھی۔ انتشار شروع ہوا۔ بزرگوں کے قائم کردہ ادب قاعدوں کو توڑا گیا اور گھر ہی کے اندر شکار کھیلا گیا اور افسوس کہ امیر الامرا سید حسین علیخاں کی جاگیر اور مہاراجہ شتاب رائے کی زمین ایسی شکار گاہ بنی! اور پھر افسوس کہ زمین ہند اور تاریخ ہند میں بہار اور بہاریوں کے نام پر ایسا دھبہ لگ گیا اور ان کے دامن پر اس خون کا داغ پڑ گیا۔

ابھی آپ نے فورٹ ولیم کالج کا حال پڑھا اور دلی اردو سوسائٹی اور سائنٹیفک سوسائٹی کی روداد پڑھی اور ان دو قوموں کی متفقہ کوشش کے نتیجہ کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔ مگر شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ الہ آباد کے نیچے ہمیشہ سے الٹی گنگا بہتی ہے! ایک طرف تو اتفاق و اتحاد کا وہ زور اور یہاں گنگا جمنا کے سنگم پاس افتراق و دوئی کا وہ شور مچایا جائے کہ تربینی پھاند کر وہ آزاد یورپ اور مگھدیس کو بھی ناس کر دے!

اسی زمانہ میں جبکہ علیگڈھ سنٹیفک سوسائٹی اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن ملک کی اصلی ضرورت دکھا کر اس فیاض گورنمنٹ سے ایک اردو یونیورسٹی مانگ رہی تھیں اور قریب تھا کہ یہ نعمت عطا ہو کر ۲۵ کروڑ مخلوق کی تعلیمی ضرورت

بہت کم خرچ اور کم مدت میں پوری ہو کر انہیں انسان بنا دے کہ اسی اکبر کے الہ باس اور خدا بخشے بابو سردوا پرشاد سنڈیال کے گھر سے مخالفت کا ایک طوفان اٹھا جو یورپ پر چھاتا ہوا خلیج بنگالہ کے کنارے جا لگا۔ یہ اسی طوفان کا زہریلا اثر تھا کہ ۱۸۷۲ء میں بنگال بہار کے چند نئے تعلیم یافتوں کی کوششوں سے وہاں کی گورنمنٹ میں فارسی حروف یعنی اردو کے اٹھا اور مٹا دینے کی درخواست پیش ہوئی۔ پورے چھ برس سمجھدار حکام نے اسکی طرف کوئی التفات نہ کی مگر آخر

ع شامت اعمال ما صورت نادر گرفت!

مشہور مکڈانل صاحب کا قدم مبارک بہار کی نرم اور پولی زمین پر جا اور انکی توجہ و برکت سے گڑے مرے اکھڑے اور اس داخل دروفتر عرضداشت کے حروف زندہ کئے گئے اور آخر ۱۸۸۱ء میں سر ایشلی ایڈن کے نادری حکم نے وہاں سے اردو کو شہید کر کے بہار اور بہاریوں کو ہزار برس پیچھے ڈھکیل دیا!!

اس حکم پر ایک غلغلہ اٹھا اور تہلکہ مچ گیا۔ اس کے خلاف عرضیوں پر عرضیاں اور میموریل پر میموریل بھیجے گئے۔ مگر راج ہٹ کے آگے سب ردیاں اور ٹوائلٹ پیپر نکلے۔ لندن میں اس نئے انصاف کے خلاف آوازیں بلند اور کمیٹیاں قائم ہوئیں۔ مرحوم لارڈ اسٹینلی آف ایڈرلی نے ایوان پارلیمنٹ کو اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ہلا ڈالا اور وزیر ہند پر جواب پر جواب طلب ہوتے رہے اور سائنٹفک سوسائٹی کے پیٹرن ڈیوک آف آرگائل کے جانشین لارڈ نورتھ بروک بوکھلائے اور گھبرائے۔ اور آخر دھیمے سر دل میں ارشاد ہوا تو یہ کہ تبدیلی بہاریوں کے فوائد کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ اور اس سے انہیں سرکاری دفاتر کی کارروائی اور

اپنے مقدمات کے سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی!

یہ پیاری منطق اگر صحیح تسلیم کرلی جائے تو اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ بیچاری بہاری رعایا دفتروں کی کوٹھریوں تک جاکر بند ہوجاتی اور آگے نہیں بڑھتی ہے یا اگر کسی طرح چھوٹ کر ججوں اور کلکٹروں کے اجلاس تک پہنچ گئی تو انکی خاطر سے اسوقت ان ہی کی بولیوں اور انہیں کے لفظوں میں بحثیں ہوتیں اور فیصلے لکھے جاتے ہیں تاکہ پیاری رعایا بغیر کسی کی مدد و معاونت کے اپنی قسمت کا فیصلہ خود سُن اور سمجھ سکے۔!!

اس تبدیلی نے اسوقت کی بہار گورنمنٹ کی نظر میں جو فائدہ پہنچایا ہو اُسکے دیکھنے کے لیے افسوس ہمارے پاس کوئی آلہ نہیں اور افسوس امریکن ایڈیسن بھی پاس نہیں جس سے ہم کوئی ایسا آلہ بنوا سکیں جس کے ذریعہ سے فوائد کے وہ ذرات چمکتے ہوئے نظر آجا سکیں جو ان نکڈ آنکھوں سے ابتک سجھائی نہ دے سکے!

ہم نے تو یہی پڑھا اور یہی دیکھا ہے کہ تعلیم یافتہ اور دماغی سود ذہنی تربیت پائی ہوئی جماعت کی تقلید و شاگردی ہمیشہ غیر تعلیم یافتہ اور ان پڑھ گروہ نے کی اور انُ سے کرائی گئی ہے اور اسی میں کسی ملک کی بہتری سمجھی اور سمجھائی گئی ہے لیکن یہ عجیب واردات اور اس ملک کی تاریخ میں جلی حرفوں سے لکھ رکھنے کی بات ہے۔ کہ سنہ ۱۸۰۸ء سے سنہ ۱۹۱۶ء تک ایک اعلیٰ طبقہ اپنے سے کم اور ادنیٰ درجہ والوں کی غلامی پر اس طرح معذور و مجبور کردیا گیا ہو اور سچ یوں ہے کہ دماغی و ذہنی ترقی کی جس طرح بہار میں توہین و تذلیل کیگئی اسکی مثال دنیا کی تاریخ اور صفحہ روزگار پر ڈھونڈھے نہیں مل سکتی!

لیکن اس نئی امت نے اس پرانی زمین (بہار) پر جو ہل چلا دیا ہو۔ مگر
امیر الامراء کے یاد رکھنے والے اور شتاب رائے کی عزت کرنے والے اس اتحاد کو
مرتے دم تک بھولے جو اس اردو اور اس کے فارسی حروف کی بدولت ایک عرصہ
سے اس ملک میں قائم ہو چکا اور جس کے سایہ کے نیچے یہ دو قومیں گردنوں میں ہاتھ ڈالے
ہوئے مزے سے سو رہی تھیں! مرحوم مہاراجہ دربھنگہ رائے سکھ راج بہادر،
رام کشن پانڈے۔ اور رائے ماتا دین کے سے خاندانی بزرگوں نے اپنی زبان
اور اپنے حروف کسی حال نہ چھوڑے اور ہزار سال کے ہندو مسلم اتحاد کو آخر تک
نباہے چلے گئے! اور آج بھی وہاں کے خاندانی بزرگوار اپنی اگلی روش پر سلامت
اور اپنی پرانی یگانگت پر ثابت قدم ہیں اور اسی قدیم بہار میں آج بھی اولڈہم صاحب
(گزشتہ جج) کا سا شخص موجود ہے جس کی زبان اور جس کا قلم ایک طرح چلا، لیکن لغزش
نہ کھائی اور وہ وہاں پرانے شریف انگریزوں اور ان نجیب سویلینوں کے مبارک
عہد کو یاد دلا رہے ہیں جن کی ملت و محبت اور ہماری زبان سے آشنا ہونے کی بدولت
ہمارا یہ باغ سرسبز و شاداب دکھائی دیا۔

اس رنگ میں بھنگ اور اپنے ہزار سالہ اتحاد کے یوں پامال ہو جانے کی
روداد جب میں نے ایک فرنچ مورخ کی زبان سے سنی تو سچ کہتا ہوں کہ میرا قلب
بھر آیا اور آنسو کسی طرح تھم نہ سکے! اس شیریں زباں نے اس پر جھلا کر جو کچھ
کہا اسے دہراتے تو مجھے شرم آتی ہے۔ مگر اس کا دوسرا چست فقرہ پاران
اسپری اینوراد نیونلی تی (Par Unespirtetriot Nationality)
کسی طرح بھولتا نہیں اور ہمارے لئے بڑا سبق آموز ہے!

دوستو۔ یہ اسی نحس سال کی گرہ تھی جو آج تک کٹی نہیں اور اپنی قومیت کے الگ قائم کرنے کا یہ وہ تنگ رستہ تھا جو اب تک کشادہ نہ ہو سکا۔ اور جب کہ اسی یادگار سن ۱۸۸۰ کے کچھ ہی بعد انڈین نیشنل کانگرس کا یہاں وجود ہوا تو ایک اچھے اور بڑے طبقہ کو یہ شکایت کر کے اس سے الگ تھلگ رہنے کا موقع مل گیا کہ جنہوں نے صدیوں کے ساتھ کے بعد عین رستہ میں ہمیں اکیلا اور تنہا چھوڑ کر اپنی دوسری راہ نکالی ہو انکی رفتار پر اب آگے کیا بھروسہ کیا جاسکتا ہے یہ ہے ہمارے زوال و پامالی کی تاریخ جسے اُس منحوس سن سے پہلے نہیں بلکہ بعد کو تلاش کرنا اور عینک لگا کر اچھی طرح دیکھنا چاہئے ۔!!

حکام وقت کی اتنی بڑی چوک اور دو قوموں کے اس طرح ٹکرا جانے سے وہ شعلۂ فساد نکلا اور بلند ہوا کہ اگر وکٹوریہ کی سی مہربان ملکہ اپنے اخلاق و کرم کے آب سرد سے فوراً اسے نہ بجھا دیتی تو سن ستاون کا غدر پھر تازہ ہو کر ملک میں آگ لگا دیتا۔ یہ ہماری پیاری ملکہ ہی تھی جس نے اپنی رعایا کا خیال کر کے اُسی زمانے میں خود اس اردو کو سیکھا اور یوں اُن کے زخم جگر پر مرہم رکھا اور دلی کے دیوان خاص کے بعد ایوان بکنگھم میں پھر اس زبان کا طوطی بولنے اور چہکنے لگا اور یہ اسی نغمہ کا اثر تھا کہ اس مہارانی کا پوتا اور ہمارا موجودہ شاہنشاہ جب یہاں قیصر ہند بننے تشریف لایا تو دلی شہر میں اپنی جاں نثار سپاہ سے اُسی ملکی زبان اور شاہجہانی اردو میں مخاطب ہوا اور یہ وہی شاہی اثر ہے کہ اب بھی لیڈی چمسفورڈ رعایائے ہند کو اپنی موجودہ ملکہ کا محبت بھرا پیغام اسی رانی جودہ بائی کی زبان میں سنانے کھڑی ہوتی اور اس طرح ہمارے دلوں کو

موہ لیتی ہیں!!

یہ چار ہزار برس کی داستان جو کومیڈی اور ٹریجیڈی دونوں کا مرقع تھی آپ کے سامنے پیش کر دیگئی۔ اب چلتے چلتے مقدس و برگزیدہ بودھ کی زبان سے اتنا اور سن لو کہ دھرم کرو، دھرم کرو، اردو کا سنکھ پھونکو اور اردو کی ڈنڈ مچاؤ اور بس!!!

غیر آریا و آریا ہند میں

عجائباتِ عالم میں سے عجیب تر اس کا وہ حصہ ارضی ہے جسے ہم آریا ورت[1] یا ملک ہند کہتے ہیں! اس زمین کی ہمیشہ سے یہ شان رہی کہ اُس کا کوئی خطہ کسی ایک قوم اور کسی ایک نسل سے کبھی بھرا پُرا نظر نہ آیا۔ سارے جہاں کی نیرنگی و رنگینی اسی ایک باغ کے اندر سمٹ کر چلی آئی دور دراز زمینوں کے بیج لا لا کر یہاں ڈالے گئے اور سات سمندر پار کے تازہ قلم یہاں لگائے گئے۔ بھانت بھانت کا جانور اس وحش خانہ[2] و رمنہ میں بولا اور چہکا۔ اُن کے زمزموں نے دنیا کے کان کھڑے کر دیئے اور انکی آوازوں پر بے چین دل ادھر متوجہ ہو گئے

---

[1] آریاورت = آریہ معنی بزرگ و ورت مسکن یعنے آریوں کا گھر۔ آریا ورت ہندوستان کے شمالی حصہ کو پنجاب سے لیکر مگدھ دیس (موجودہ بہار) تک کہتے تھے۔ پھر بنگالہ فتح ہو کر اس میں ملا۔ اور اٹک (انڈس) سے برہم پترا (مشرقی دریا) تک سب ایک ہو کر آریا ورت ہو گیا۔

[2] وحش خانہ = وہ جگہ جہاں قسم قسم کے جانور رکھے جاتے ہیں۔ اسے رَمنہ اور (انگریزی میں) زُو بھی کہتے ہیں۔

اس باغ کی اسی روش نے اُسے ایسا سدا بہار بنا دیا کہ بیرونی دنیا آج تک اُس پر مٹی ہوئی اور یہاں کی خاک سرمۂ کشش دیدۂ شوق بنی ہوئی ہے!!

باغ ہند چمنستان عالم کا ایک نمونہ[1] ہے۔ مگر کھلتا نہیں کہ اول کس آدم نے اس زمین پر قدم رکھا، جس کی برکت سے ہندوستان جنت نشان مانا گیا؟ یہ بہت بعد کی حکایتیں ہیں کہ اس ارض پاک کی عالمگیر شہرت نے دنیا کو اسطرف کھینچا اور یہاں کی خاک پر اُن کے سروں کو جھکوا دیا!

اُن خوش نصیب اقوام میں سے اوّل اول جن قوموں نے اِدھر آجانے کا شرف حاصل کیا وہ تین مختلف نسلوں کی یادگار تھیں۔ جو یہاں کے تین مشہور راہوں سے اندر داخل ہوئیں۔

اوّل تبتی برمی (Tiblus-Burman) شمال و مشرق سے ہمالیہ[2] کی سفید برفستانی چوٹیاں پھاندتے ہوئے اِدھر آئے اور اب بھی اُس کے دامن میں پھیلے ہوئے اور ہماری مشرقی حد سے بھی کچھ آگے نکل گئے ہیں۔

دوم۔ کولاری (Kolarians) یہ پُوربی کونہ سے اِدھر آئے اسی لیک پر چلے۔ بنگالہ پہونچے اور پھر (مشرقی) دکھن کی طرف اُتر گئے۔

سوم۔ دَرَوِیدی = (Dravidians) انہوں نے شمال و مغرب (بابُ الہند) سے سر نکالا، پنجاب میں ڈیرہ ڈالا اور بعد کو کنار سمندر کی ہوا کھاتے، کتراتے (مغربی) دکھن پہونچے اور آخر اس کی انتہا یعنی راس کماری

---

[1] دنیا نے تسلیم کر لیا ہے کہ اس عالم میں الگ الگ جو کچھ ہے وہ سب اُس ایک زمین میں موجود ہے۔ [2] ہمالیہ سنسکرت میں برف کے ڈھیر (تودے) کو کہتے ہیں۔

(کیپ کومرن) تک پھیل گئے۔

یہ قومیں یہاں کے دیسیوں[1] (Aborgines) سے ملیں اور پھر ان پر کچھ اس طرح چھائیں کہ دیسیوں اور پردیسیوں کی پہچان نہ رہی اور آخر ان کل قوموں کا ایک ہی نام، یعنی غیر آریا پڑ گیا۔ اور وہ آج تک اسی نام سے مشہور رہا۔

غیر آریا زبان۔ زبانیں انسان کے اور حرکات و سکنات کی طرح خود بخود پیدا ہوئی ہیں۔ اندرونی تحریکوں سے اُبھر کر[2] منہ سے کچھ نکل جانا فطرت ہے اور اسی کچھ نکل جانے، کا نام بولی ہے۔ اس فطرت کو پراکرت[3] کہتے ہیں اس لئے ایسی بولیوں کو بھی پراکرت، یعنی فطری بات کہنے لگے۔

پراکرت انسان کا جوہر ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں کے فطرت نے یہاں کے دیسیوں یا اُن غیر آریوں کو ایسی نعمت سے محروم رکھا ہو۔ نہ ایسا ہوا اور نہ ایسا ہو سکتا تھا۔

غیر آریا انسان بھی نطق سے خالی اور اظہار مطالب سے عاری نہ تھا۔ وہ مسافر جب ادھر آیا تو اپنی پراکرت کا توشہ[4] بھی ساتھ لایا۔ جسے یہاں کے دیسیوں کے آگے بھی رکھا۔ اور انکی جھولیوں سے جو کچھ نکلا وہ اُن پردیسیوں کے نذر ہوا اور اس طرح دونوں کا پیٹ بھرتا اور کام چلتا رہا۔

---

[1] دیسی۔ اس عام لفظ کو ہم نے خاص معنوں (یعنی یہاں کے اصلی و قدیم باشندے) میں لیا ہے [2] اُبھرنا ہندی ہے۔ یعنی سخت مجبور ہو کر پیٹ کا اُپھرنا، پھولنا وہ حالت کہ اگر فوراً اس کا دفعیہ نہ ہو تو ہلاکت ہے [3] پراکرت = نیچرل۔ فطری (فورلس، ہندوستانی ڈکشنری)

[4] مسافر گھر سے کھانے، پینے اور دیگر ضروریات کی جو چیزیں لیکر نکلتا ہے اسے توشہ کہتے ہیں۔

جن ایام جاہلیت کا یہ ذکر ہے اس وقت کی دنیا ہی اور تھی۔ ایک اس زمین کا نہیں سارے جہاں کا یہی نقشہ تھا کہ جس جرگے اور جس خیل کو جہاں جو جگہ بھا گئی اتر پڑے اور ڈیرے ڈال دیئے اور اپنی الگ الگ ٹولیاں بنا کر رہنے لگے۔ اس تقسیم نے انہیں توڑ دیا۔ اور پھر انکی زبانوں کے بھی ٹکڑے ہو گئے اور آخر ایک بولی سے رنگا رنگ بولیاں پیدا ہو کر یہ باغ اچھا خاصہ وحش خانہ بنگیا۔

یہی بولیاں اُن کی بھاکھا[1] کہلائیں اور یہاں عشق پیچہ[2] کیطرح چھائیں۔ آریوں کی سی زبردست قوم اور انکی دیوبانی[3] زبان (سنسکرت) بھی ان بیلوں کو چھانٹ نہ سکی وہ اس زمین پر پھیلتی، جڑ پکڑتی اور قسم قسم کے پھول پیوند کے سہارے چڑھتی اور پھولتی پھلتی رہیں۔

غیر آریوں کا تمدن۔ یہ زمین ایک مدت تک اُن غیر آریوں کا گھر بنی رہی۔ ممکن نہیں کہ اپنی آسائش کے رستے انہوں نے نکالے نہ ہوں۔ مگر زمانہ اور حکمراں قوم (آریا) کی سختیوں نے اُن کے تمدن کے آثار مٹا ڈالے۔ پھر بھی جو کچھ ظاہر ہو سکے وہ اُن کی انسانیت ثابت کرتے ہیں۔

آریا غیر تھے۔ اس پر انہوں نے ان کی نسبت جو کچھ کہا اُس سے بھی انکی وحشت نہیں بلکہ آدمیت ظاہر ہوتی ہے وہ مقابلہ کے نہ ہوتے تو آریا کی سی قوم اپنے دیوتاؤں کی مدد سے ان پر فتح پانے کا اشارہ نہ کرتی۔ ویدکے

---

[1] اُن کی بھاکھا (بولی) کو شروع میں پہاڑی، کولاری اور تبتی وغیرہ کا لقب دیا گیا۔ مگر زمانہ کے ساتھ نام اور ان بھاکھا کے حالات بھی بدلتے رہے [2] عشق پیچہ (پیچاں) وہ بیل جو پیچ در پیچ ہوتی اور جلد مرجھاتی نہیں [3] دیوبانی = زبان الٰہی، کلام ربانی۔

منتر ہیں کہ :-

ہم اس زمین پر اپنے دیوتاؤں کی مدد سے بیٹھے۔ اور ان کی بدولت ناک والوں[1] نے اُن پکھنوں کو پچھاڑا ! (میکس مُلر)

پھر اپنے اُن دشمنوں (دس یُو) اور غلاموں (داسا) کو زیر کر لینے کی خوشیاں ہوتی ہیں۔ اور دیوتاؤں کا بھجن یوں گایا جاتا ہے۔

وہ تو وہی ہے جس نے اُن بیریوں (غیر آریا) کو مارا۔ اور آریوں کو لالوں لال[2] کیا اور کالوں کو گوروں کا غلام بنا دیا ! (میکس مُلر)

ان کو نام بھی رکھا جاتا ہے کہ

وہ ایک ملیچھ اور نکٹی قوم ہے اور ہم ناک والے ہیں۔ (میکس مُلر)

پھر ان کے مُردوں تک کی ہنسی اڑائی جاتی ہے کہ[3]

انہیں طرح طرح کے کپڑے اور قسم قسم کے گہنے پہنا کر سونپتے ہیں۔ جن سے وہ دنیا کو پھر بھا سکیں گے ! (میکس مُلر)

ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر آریا نرے وحشی نہ تھے اور اسی وجہ سے گو باہر والے انہیں زیر کرتے اور اجاڑتے رہے۔ لیکن ان کا بیج نہ مار سکے۔ شمالی ہند (آریوں کا مسکن) میں بھی وہ زمین گیر رہے اور آخر آریوں کو

---

[1] آریا۔ اونچی ناک والے، اور غیر آریا زیادہ تر چپٹے ناک نقشے کے تھے۔

[2] لالوں لال = اس میں اپنے رنگ و روپ کی طرف اشارہ ہے۔ وہ گورے چٹے اور سُرخ و سپید تھے۔

[3] غیر آریا اپنے مُردوں کو جلاتے نہیں گاڑتے تھے

بھی انہیں مان[1] لینا پڑا۔

ان میں کے جو ذرا کمزور تھے وہ البتہ بھاگ گئے اور زیادہ تر دکھن کے جنگلوں اور پہاڑیوں[2] میں جا گھسے۔ بعض دل چلے آگے نکل کر اپنی دوسری غیر آریا جماعت سے جا ملے اور اپنی الگ بستی بسا کر اُن جنگلوں میں ایسا شیر بنے کہ (راجہ) رام چندر جی کے سامنے کھڑے ہو سکے اور رامائن کی سی تصنیف کا ایک اچھا حصہ اِدھر کے کارناموں کے نذر ہو کر اُن بہادروں کے نام سے معنون ہو گیا۔

غیر آریا کبھی نہیں مٹے۔ نہ محض آریوں کا بیان بلکہ اور روایات و آثار بھی ان غیر آریوں کی مضبوطی کے شاہد ہیں۔ اور ظاہر ہوتا ہے کہ بیرونی حملوں کا اثر کبھی اُن پر نہیں پڑا کہ وہ نابود ہو جاتے۔

آریا بہ یک دفعہ اور کسی بڑی جمعیت کے ساتھ اِدھر نہیں آئے بلکہ گروہ گروہ ہو کر بڑھے۔ ایک جماعت گھر سے چلی، پنجاب کے اُدھر ٹھہری، اس کی دیکھا دیکھی دوسرا قافلہ کھڑا ہوا۔ وہ بھی پہونچا۔ مڈ بھیڑ ہوئی۔ ایک نے دوسرے کو ریلا اور ڈھکیلا۔ اس طرح یہ آریہ بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہونچے۔ ان میں خوب پھوٹ تھی۔ ملتے تو غیر آریوں سے بھڑتے۔ اِدھر کا زور بھی کم نہ تھا اس لئے برسوں کی ڈھینگا مشتی[3] کے بعد وہ گرے، مگر زمین پکڑے رہے۔

۱؎ غیر آریوں کی اکثر ریاستیں آریوں کے عروج تک قایم رہیں (ویبر مشہور جرمن محقق) ۲؎ جو اس طرح بھاگ گئے وہ پھر تمدن کے رستہ پر نہ آ سکے۔ مدراس کے مَنڈا اور اڑیسہ کے جوآنگ پٹیوے۔ وندھیاچل کے شمالی بھیل، گونڈ، ہینڈا، مالابار کے پولیئے وغیرہ وغیرہ یہ سب نکالے اور بھاگے ہوئے غیر آریا ہیں۔

۳؎۔ آریوں اور غیر آریوں کی کسی باضابطہ لڑائی (سوا راون کے اور وہ بھی دکھن میں) کا ثبوت نہیں ملتا اس لئے اس مڈ بھیڑ کو ڈھینگا مشتی سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

غیر آریا بڈی بھی سخت اور پولی مٹی کی نہیں بلکہ بجری اور خوب کٹی پٹی ہوئی تھی۔ وہ ایک زمانہ سے اس زمین پر اپنا گھر بنائے ہوئے تھے انکی گڑھیاں[1] اور قلعے آریا چھاتیوں پر پہاڑ تھے اور ایسا تھے کہ بھجنوں میں یاد کئے گئے اور انکے گرنے پر دیوتاؤں کے آگے منت کے پھول چڑھائے گئے۔ اس پر بھی انکی بڑائی منائی گئی۔ مگر والمیکی نہ رہ سکا۔ وہ راماین میں ایک موقعہ پر ان کی مضبوطی کی داستان چھیڑتا اور آریوں کی جنگ میں ان کے ایک پہلوان کا رجز یوں سناتا ہے

ہم ایک نڈر قوم ہیں۔ نیلے بادلوں[2] کے سے (زمین پر) پہاڑ ہیں

لڑائیوں میں آندھی ہیں اور ہم ہٹنے والے اور پیٹھ[3] دکھانے والو نہیں

نہیں ہیں! (ہنٹر مشہور مورخ)

یہی مضبوطی اور قومی سختی تھی جو انہیں جلائے اور ہمیشہ ملائے رہی اور اسی کی بدولت وہ اس زمین پر آج بھی کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی ہستی سے اس زمین نے فائدہ اٹھایا۔ اور نہ صرف یہاں کی پیداوار اور دیگر اسباب[4] زندگی ہی

---

[1] ویدوں میں غیر آریوں کی متعدد گڑھیوں اور نوے قلعوں کا ذکر آیا ہے۔

[2] نیلے بادلوں میں اپنے رنگ و روپ اور ڈیل ڈول کو بتایا ہے۔ رام لیلا میں بھی دشمن کی فوج کے سپاہی اسی سج دھج سے لائے جاتے ہیں۔

[3] آں نمن باشم کہ روزے جنگ بینی پشت من۔ ہند و فارس کی زبان و خیالات میں کس درجہ اتحاد ہے۔

[4] کل حرفے اور پیشے عموماً غیر آریوں کے ہاتھ رہے۔

اُن کے زیر بارِ احسان رہے، بلکہ ملک کی آبادی بھی زیادہ اِنہیں کی شکر گزار ہے
جو غیر آریا بستیوں اور آبادیوں میں رہ گئے وہ آریوں کے تحت و تصرف
میں آئے اور اس تصرف نے فطرت کے مطابق اُن میں وہ تعلقات بھی قائم
کردیئے جس سے توالد و تناسل میں نمایاں ترقی ہونے لگی۔ اس کے علاوہ حکمراں
قوم (آریا) کے تشدد پر بھی خفیہ اور بہ آہستگی اُن کی حیثیت بڑھتی رہی یہی وہ
تدریجی وہ پوشیدہ ترقی تھی جس نے آخر بودھ مت کو اُنکی بنا دیا اور مسلمانوں کے[1]
وقت میں وہ شمشیر نکلے اور اَب[2] تو چلتے ہوئے طنیچے دکھائی دیتے ہیں
ان میں کی خالص و غیر خالص، دونوں جماعتیں ملکر آخر اس ملک کی

---

[1] بودھ کا حال تو سب جانتے ہیں مگر مسلمانوں کے وقت میں ان غیر آریا کا درجہ کس طرح بڑھا اس
اس پر کم نظریں پڑی ہیں۔ آگے کچھ حال ملیگا۔ یہاں اتنا سن لو کہ ہیمو بقال جس نے پٹھانوں کے زمانہ
اور سلیم شاہی دور میں وزارت اور عدلی شاہی میں بادشاہت کی اور پھر اکبر کا مقابلہ کیا وہ بقول ابوالفضل
قوم کا ڈھوسر اور نیچ ذات کا بنیا اور غیر آریا تھا! راجہ (موتمن الدولہ عمدۃ الملک)
توڈرمل وزیر ایک پنجابی کھتری اور معمولی گھر کے آدمی تھے۔ اس سے اتنا سمجھ میں
آسکتا ہے کہ مسلمانوں نے ان بیچارے غیر آریوں اور شودروں کو جو زمانہ سے غلامی
میں تھے کس طرح آزاد کر کے اپنے برابر کر لیا۔

[2] انگریزوں نے بھی مسلمانوں کی تقلید کی۔ اسوقت بھی حکومت کے مشیر آریا کم اور غیر آریا
زیادہ ہیں اور وہ وقت آلگا ہے کہ شودر برہمن کے برابر ہو جائیں۔

ریڑھ کی ہڈی نہیں طبقہ اوسط (Middle class) ہی کے لوگوں پر کسی ملک کی ترقی و بقا منحصر ہے۔ اور یہ غیر آریا ہی یہاں طبقہ اوسط میں شمار ہو سکتے ہیں۔ اس ملک کی مردم شماری اس راز کو اور کھول دیتی ہے۔

آریا (برہمن و رجپوت وغیرہ) پونے دو کروڑ سے زیادہ نہیں! درخالص (یعنی ناشائستہ) غیر آریا، دو کروڑ سے اوپر ہیں۔ اور متمدن[1] غیر آریا (جسے مخلوط یا ملی ہوئی جماعت Mixed people کہتے ہیں جو گر کے اٹھے اور طبقہ اوسط میں گنے گئے وہ بارہ[2] کروڑ سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔

یہ حساب اس جماعت کی مضبوطی کو سمجھا کر اُنکی آئندہ ترقی کی نسبت بہت کچھ بتا سکے گا!!

غیر آریوں کا مستقبل۔ یہاں کے سوا اور ملکوں کے دیسی یا تو فنا ہو گئے یا بہت بری حالت میں رکھے گئے۔ عرب کے بدوؤں اور ایران کے لروں کی نسبت تو کہا جائے گا کہ اُن کے رکھ والے خود وحشی یا نیم وحشی تھے اس لئے وہ

---

[1] ناشائستہ غیر آریوں کو تو پہلے بتایا جا چکا۔ اب سنو کہ مدراس کے سجیلے نائر دکھن کے جیالے مرہٹے، سندھی موٹے بنئے دکھنی بھائیٹے، گماشت مارواڑی، پنجاب کے سورما جاٹ اور شیر دل سکھ، پوربی اہل قلم کائستھ اور بنگلہ دیس کے زبان آور بنگالی بھی متمدن غیر آریا اور مسلمانوں کے بڑھائے ہوئے ہیں۔

[2] یہ تعداد سرکاری علاقہ کی ہے۔ ریاستوں کا شمار نہیں۔ وہاں کی چھ سات کروڑ کی آبادی میں تین حصہ غیر آریا ہیں۔ اس لئے کہ عموماً ریاستیں دکھن کی طرف ہیں اور وہی ان (غیر آریا) شیروں کا بیشہ رہا ہے۔!

حیوانِ انسان کیوں کر بن سکتے تھے؟ لیکن موجودہ شایستگی کے مدعی انسان اس معاملہ میں کیا کر چکے! اور کیا کر رہے ہیں؟ وہ دیدنی ہے۔ آسٹریلیا و نیوزلینڈ کے دیسیوں اور میکسکو اور پیرو کے قدیم باشندوں اور شمالی امریکہ کی سرخ قوموں (Red Indians) کے ساتھ اس وقت کے مہذب و شایستہ گوروں نے جو سلوک کیا وہ ظاہر ہے!! مگر یہاں اوّل گئوتم بدھ کے طفیل پھر مسلمانوں کی بدولت اور اب انگریزوں کی توجہ سے ہمارے غیر آریا اور دیسی نہ صرف زندہ ہی رہے بلکہ ان میں کی اکثر جماعتیں اپنی صنف سے بہت آگے نکل گئی ہیں!

اس میں شک نہیں کہ انکی سخت جانی بھی انکی بڑی مددگار رہی لیکن انصافاً یا ضرورتاً مسلمانوں اور انگریزوں نے بھی ان کا بہت ساتھ دیا۔ اور گزشتہ واقعات کو پیشِ نظر رکھکر اور موجودہ حکومت کے رجحان کو دیکھکر حکم لگا دیا جا سکتا ہے کہ غیر آریوں کا مستقبل بہت شاندار رہے

مسلمانوں کی تلقین[۱] و تعلیم تو کب کی بند ہو چکی۔ سکھوں کی گرنتھ[۲] بھی

۱؎ ہندی اسلامی سلطنت کی طرف سے تو کبھی کوئی باضابطہ مشن قایم نہیں ہوا۔ مگر ان کے مشایخین نے اس فرض کو حسن و مدارا کے ساتھ انجام دیا۔ اور یہاں کے کذات (کجات) کو ذات دار اور اپنا بھائی بنا کر ساتھ کھلایا اور ان کا درجہ بڑھایا۔

۲؎۔ بابا نانک (لودھیوں کے وقت میں) نے بھی یہی کیا۔ اُن کے بالا (ہندو) اور مردانہ (مسلمان) دو چیلوں کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۷ پر دیکھیے)

کھلتی نظر نہیں آتی۔ اس لئے اب مشنری ہی خدائی فوجدار ہیں اور وہ دن دور نہیں کہ تاریکی دور ہو اور غیر آریا (دیسی) روشنی میں آکر زیادہ صاف و شفاف نظر آنے لگیں۔

اس کے سوا زمانہ خود انہیں بڑھا رہا ہے اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا وہ متمدن ہو کر یہاں کے طبقہ اوسط میں مل رہے اور اس ملک کی ریڑھ کی ہڈی بن رہے ہیں۔ اور جب وہ اپنے متمدن غیر آریا بھائیوں میں جذب ہو جائیں گے تو پھر طاقت کس کے ہاتھ میں ہوگی؟ اور اسی کے ساتھ پھر کس کی اور کونسی زبان تیز رہے گی؟ اس کا سمجھ لینا دشوار نہیں ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۶) وہ یہاں کی گری ہوئی قوموں کو اٹھانا، دوری کا مٹانا، دو ندہموں کو ملانا اور اس ملاپ سے ایک نئی زبان (جو دونوں کے لئے قابل قبول ہو سکے) پیدا کر کے قومیت (نیشنلزم) کی بنیاد قائم کر دینا چاہتے تھے! ؎

نانک تہہ میں در نہیں، نبی گیو کس بار جیسے چھچھ سے ایچھ نکس جات ہی بار

کہتے ہیں کہ اے نانک آسمان (تہہ) میں تو در نہیں، یہ نبی اس میں گئے کیوں کر؟ خود جواب دیتے ہیں کہ جیسے عینک (بچھچھ) سے نظر (ایچھ) پار ہو جاتی ہے! معراج کے متعلق بابا نانک کا یہ شعر غور کے قابل ہے۔

لہ عیسائی مشنری (جو یورپ کی قوت سے قائم ہیں) ابھی یہاں کے جنگلوں میں پھیلے ہوئے غیر آریوں کو بپتسما (اصطباغ) دے دے کر انکی شست و شو کر رہے ہیں۔ ان کا درجہ اور بلند ہوتے ہی وہ پھر دوسرے ہو جائیں گے۔ اور ان کی زبان عربی، فارسی، ترکی سنسکرت اور انگریزی نہیں بلکہ ہندی اور آخر میں (لامحالہ) وہ اردو ہو جائے گی جو اس ملک کے تین چوتھائی باشندوں کی بھاکھا اور زبان ہے!!

آریوں[۱] کی آمد۔ یہ غیر آریا ابھی اس باغ کی ہوا ہی کھا رہے ہے اور اسکی بہار ہی دیکھ رہے تھے کہ ادھر وسط ایشیا کے پلیٹو (سطح مرتفع) سے ایک سورما قوم اٹھی جو آندھی کی طرح بہت جلد آدھی دنیا پر چھا گئی یہ وہی شیر تھے جو ایک طرف (مغرب) جھپٹے تو ایران[۲]، یونان، روما، اندلس (اسپین) اور انگلستان کو طمانچے مار کر نکل گئے اور دوسری جانب (مشرق) پلٹے تو چین و ماچین کو دبوچتے ہوئے ہمالیہ کے سر پر تھے۔ وہاں برسوں گونجتے اور پھر انڈس[۳] و برہم پتر کے کچھار میں مدتوں ہونکتے رہے!

---

۱ آریا سنسکرت میں بڑے اور معزز کو کہتے ہیں۔ اس زبان کو تدوین کرتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کے یہ معنی انہوں نے خود گڑھے۔ ایک جرمن محقق لفظ آر کے معنی ہل کے بتاتا ہے۔ یعنی وہ ایک کھیتی باڑی کرنے والی قوم تھی۔

۲ ایران تو ان آریوں کے نام ہی سے بنا۔ یونان میں ایتھنس و اسپارٹا کی بنیاد انہوں نے ڈالی، روما کے ہفت کوہ (The seven Hills) ایسے اٹھائے کہ اس سلطنت کا بوجھ سنبھالے رہے۔ اندلس (اسپین) کی چاندی انہیں کے دم سے چمکی اور انگریزوں کی زمین ان ہی کے قدم سے دمکی!

۳ انڈس و برہم پتر ہند کے دو مشہور مغربی و مشرقی دریا ہیں۔ انڈس کا ہندی نام اٹک ہے۔ یونانیوں نے اسے انڈس خطاب دیا اور وہ اب تک بحال ہے۔ برہم پتر یعنی خدا (برہما) کا بیٹا اس دریا کے منہ پر یہ لقب پھبتا بھی ہے۔ اس میں واقعی اس کا بڑا ظہور رہے۔!

آریوں کی آمد۔ آریوں کا اصل ٹھکانا نہیں ملتا۔ مگر سب (پرانے محققین)[1] یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ موجودہ ایران کے ذرا اوپر (اُتر) اور توران کے نیچے آدی نا، نام ایک بلند و چورس تختۂ زمین (پلیٹو) تھا اور وہی ان کا جنم بھوم ہے۔ یہ اپنے دیس سے بنجاروں کی طرح نکلے۔ نیا دانا۔ نیا پانی کھاتے پیتے بہت دور چلے آئے۔ یہاں قافلہ کے ٹکڑے ہوئے ایک پچھم چلا اور دوسرا پورب کو مڑا۔ اس طرف جس نے منہ کیا وہی ہمارے وہ آریا ہیں جو ٹھیکے[2] لیتے ہوئے آخر پنجاب (پنج آب) تک آئے اور یہاں دریائی قلعوں میں گھر گئے! یہ جگہ انہیں بہت بھائی، اپنی بستی بسائی اور کھیتی لگائی۔ انڈس (دریا) بڑا مسافر نواز تھا۔ انہیں جلد اپنا کر لیا۔ یہ بھی اس کے ہو گئے اور دیکھو کس محبت سے اُسے پکارتے ہیں۔ بھجن۔

انڈس! نام آور انڈس! دریا دل انڈس! ہمارے کھیتوں کی بھی
خبر لے اور ان کی پیاس بھی بجھا دے! (میکس مُلر)

---

۱ پرانے محققین اور جرمن مورخین بھی آریوں کا اصل ٹھکانا نہیں بتاتے ویبر (مشہور جرمن محقق) بھی اس راز کو کھول نہ سکا۔ اپنے لکچروں (۱۸۵۲ء) میں اس مضمون سے گریز کر کے آگے بڑھ آتا اور آریوں کو کو کو بجا (علاقہ کابل) میں ڈیرے ڈالے دیکھتا اور پھر پنجاب تک انہیں لے آتا ہے۔ مگر حال کے انگریز اہل تحقیق آریوں کا گھر آسٹریا (ہنگری) میں بتاتے اور انکی ہندوستان آنیوالی جماعت کو درۂ دانیال سے عبور کرا کے ایشیائے کوچک میں بساتے اور پھر ہندوستان پہونچاتے ہیں! ۲ ٹھیکے لینا۔ بمعنی دم لینا۔ ٹھہرنا موسیقی میں بھی ٹھیکے لینا تقریباً انہیں معنوں میں ہے۔

وہ کشادہ زمین اور وہ پاٹ دار دریا۔ یہ مدتوں وہاں پڑے رہے اُن کی آسودگی کا چرچا پھیلا۔ جس نے ان کے دوسرے بھائیوں کو بھی ادھر کھینچا۔ زمین جھگڑے کا گھر اور بھائیوں کا بگاڑ آدم کی خو ہے۔ بنتی کیوں کر؟ ٹھنی کھٹکے۔ وہ بڑھے، یہ ہٹے اور دبتے دبتے پوربی حد کے کنارے جا لگے۔

آپس کی جنگ کے ساتھ انہیں یہاں کے اُن غیر آریوں کا سامنا بھی تھا جو قدم قدم پر ان کے سدِ راہ ہو رہے تھے۔ کوششوں کے بعد وہ بھی گرے اب رستہ صاف تھا۔ دو دریاؤں (انڈس و برہم پترا) کے بیچ میں کھڑے ہو کر اس باغ کو سینچنے لگے!

آریا زبان۔ دُنیا کی مُردہ و زندہ زبانیں عموماً تین[1] حلقوں میں تقسیم کی گئی ہیں۔

(۱) آریا (Aryans) اس حلقہ میں سنسکرت، فارسی (قدیم و جدید) یونانی، لاطینی، فرانسیسی اور جرمن و انگریزی وغیرہ زبانیں ہیں۔

(۲) سامی (Semetic) اس میں کلدانی، عبرانی اور عربی وغیرہ کا شمار ہے۔

(۳) تورانی (Turanian) اس دائرہ کے اندر تاتاری، برمی، سیامی اور پیگو، وغیرہ ہیں۔

---

[1] بعض محققین نے ان زبانوں کو چار حلقوں یا خاندانوں میں تقسیم کر کے آسٹرک کو بڑھایا اور ہندوستان سے اُس کے تعلقات بتائے ہیں۔

اس پہلے حلقہ یعنی آریہ پراکرت کی سوغات چار طرف بٹی، ایران نے اس تحفہ کو ژند[1] لقب دیا اور ہندوستان نے اس کا نام سانسکرت[2] رکھا۔ یہ ژند و سنسکرت ایک درخت کی شاخیں اور ایک گھر کی بیٹیاں ہیں۔ دونوں کی ایک تاریخ، ایک روایت اور ایک سی حکایت ہے۔ اور اتنی دوری اور ایسی مہجوری کے بعد بھی ایک کو دوسرے کا خیال، اور ایک کا دوسرے پر اثر کبھی نہ مٹا۔ وہاں اسی ژند میں ان (پارسیوں) کی مذہبی کتاب اوستا[3] نازل ہوئی اور یہاں ہماری سنسکرت میں ویدا سی کتاب میں اتری!

ادھر کا قصہ تو ادھر رہا۔ ادھر کی حکایت یہی وید سناتے اور آریوں کی بزرگی کی داستان پڑھتے ہیں۔ اگر صرف مذہب و شاعری ہی کسی قوم کی بڑائی کی سند ہوں تو آریا اس میں بھی کسی قوم سے پیچھے نہ دکھائی دینگے جب عالم میں اندھیرا تھا یہ مخلوق اپنے خالق کو ڈھونڈ لائی اور جب دماغ محدود اور علم مفقود تھے۔ انکی قوت تخیل آسمان پر تھی۔ رگ وید[4] کا زمانہ چار ہزار برس

۱۔ ژند یا زند۔ بمعنی دانستن (سنسکرت میں جند ہے۔ جن، جاننا اسی سے نکلا ہے!) ژند اور ویدی زبان تقریباً ایک ہیں۔ ۲۔ سانسکرت بمعنی مکمل سن = جامع اور کرت (Kirte) پورا کرنا۔ لاطینی میں (Creane) ہے اسی سے انگریزی میں (Create) پیدا ہوگیا!۔ ۳۔ ژند اوستا = (Zend Avesta) پارسیوں کا متبرک کلام جو شاہ پور ثانی (سن ۳۰۹، ۳۳۸ قبل مسیح) کے وقت میں مدون ہوا۔

۴۔ رگ وید۔ رگ کے معنی حمد و نعت کے ہیں اور وید معنی علم۔ انکی پیدائش ۴ ہزار سال قبل مسیح بتائی جاتی ہے (آر سی دت)

قبل مسیح ہے۔ اس وقت کوہ طور بھی اگر بے نور نہ تھا تو دور ضرور تھا۔ مگر ہند کا دماغ روشن و پر نور تھا!

اس رگ وید میں ایک ہزار سے اوپر بھجن اور دس ہزار سے زیادہ شعر ہیں اور ان نظموں میں دنیا کی باتیں ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ایک شاعر ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوتا ہے۔ یہاں قوم کی قوم فطری شاعری اور حقیقی جذبات میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ اپنے محسن انڈس کو جس انداز سے انہوں نے پکارا اسے ابھی سُن چکے ہو۔ اب دوسرے ناز و نیاز پر نظر کرو۔ بھجن

ابتدا میں کچھ نہ تھا۔ ایک حسین[1] بچہ پیدا ہوا۔ یہ کائنات اسی کی تھی

زمین و آسمان کا بنانیوالا۔ زندگی و قوت کا بخشنے والا

وہی تو ہے!

وہی وجہ موت۔ وہی وجہ حیات۔ ہر طرف چھایا ہو (محیط!)

ابر پر بھی نظر رکھنے والا۔ روشنی اور ہوا کا اندازہ کرنیوالا

وہی تو ہے!

وہی تو ہے جس کے آگے ہم جھکتے اور نیاز چڑھاتے ہیں!

وہی تو ہے!

(میکس مُلر Max Muller)

جس قوم کی یہ آنکھیں ہوں اس کا ہوش و گوش کیسا ہوگا؟ یہ اُسی درک د

---

[1] حسین بچہ = حُسنِ اوّل!

فہم کا نتیجہ تھا کہ سب سے اول انہوں نے اپنی زبان کو سدھارا کہ وہ اظہار خیالات کا بہترین آلہ اور تسخیر و تاثیر کا زبردست آرگن ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اسی زور بیان نے انہیں اتنا بڑا بنا دیا۔ اسی سے انکی ابتداء اور اسی پر انکی انتہا ہوئی اور انکی نسبت جو کچھ کہا جائے گا وہ انکی انہیں دو طاقتوں (مذہب و شاعری) کے تحت میں ہوگا۔

ویدی عہد و سنسکرتی دور = آریوں کی زبان کے دو دور ہیں۔ ایک ویدی۔ اور دوسرا سنسکرتی۔ یہ پاکیزہ قوم جب تک (موجودہ[1]) ہندوستان کے ادھر یا پنجاب میں رہی اس کی زبان و خیالات میں وہی تاثیر و سادگی تھی جو فطرت کی کسی محبوب قوم کا خاصہ ہیں۔ اور چونکہ رگ وید کی پیدائش کا یہی زمانہ ہے، اس وجہ سے اس میں یہ خاصیت تمام تر موجود ہے۔ اسے قرن اولیٰ یا ویدی عہد کہتے ہیں۔ مگر یہ وقت دیرپا نہ تھا۔ جیوں جیوں یہ قوم بڑھتی اور متمدن ہوتی گئی، ویدی آمد ختم اور سنسکرتی آورد شروع ہونے لگی۔ اور یہ تعجب خیز نہیں۔ قوموں کی ابتدائی، درمیانی اور انکی اخیر حالت میں فرق لازمی ہے۔ اور یہاں بھی یہی ہوا۔!

اس زمین پر ان (آریوں) کے قدم جم لئے اور وہ مطمئن ہو لئے تو اپنے مذہب کی تدوین[2] اور اپنی زبان کی تدہین[3] پر متوجہ ہوئے اور ان کے تمدن کا

---

[1] اس وقت میں ہندوستان کا نقشہ اور تھا

[2] تدوین = جمع کردن، ترتیب دادن۔

[3] تدہین = چرب نمودن۔

یہ دوسرا دور یعنی سنسکرتی عہد کہلاتا ہے۔ اسی زمانہ میں ان کے علم وفن اور خصوصاً اُن کے مذہب و شاعری کی تکمیل ہوئی۔ آریا علوم وفنون کا تفصیلی بیان ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ ضمناً اتنا اشارہ بس ہوگا کہ

یہ قوم اکثر فنون میں دُنیا کی اُستاد ہے (علم) نجوم میں ڈوبی تو آفتاب بنکر چمکی۔ یونانیوں کو (۳۲۷ قبل مسیح) نور اور عربوں کو (سنہ ۸۷۰ء) روشنی اور یورپ کو ضیا یہیں سے ملی!

اس علم (نجوم) کا ستارا یہاں کبھی نہیں ڈوبا۔ مغلئی دور میں محمد شاہ کا زمانہ گردش کا زمانہ ہے۔ مگر اُن ایام میں بھی اُجالا رہا۔ راجہ جے سنگھ کا (دلّی میں) رصد خانہ اور محمد شاہی زیچ (زیک جنتر منتر) کا نام ہمیشہ روشن رہے گا، جسے فرانسیسی مشہور منجم، دی لا ہا ئر نے (سنہ ۱۷۰۳ء) اپنی زمین پر بھی چمکایا

انکی ریاضی کا کیا حساب؟ جسکی مشق نے انہیں اُستادوں میں شمار کرا دیا! موسیقی اصل انہیں کے گلو میں اُتری اور انکے سرگم[۱] نے

۱؎ سرگم: ہندی راگ میں سات نئے سُروں کا اضافہ ہوا اسے سرگم کہتے ہیں۔ یہ سُر فطرت سے اتنا ملے ہوئے ہیں کہ رُوح پر بے اختیار ان کا اثر پڑتا ہے (س، رَ، گ، م، پ، دھ، نِ) عرب اور ایران نے اُن سُروں کی یوں نقل کی (دَ، رِ، مَ، فَ، صَ، لَ، بَ) یعنی دُرِّ مفصل! ایرانیوں اور خصوصاً عربوں کے ذریعہ سے یہ فن یورپ پہونچا اور گیڈو د آرِزو وہاں اپنی موسیقی کا راگ اس میں گانے لگا!

فطرت کی آواز سے آواز ملادی! ان کی آیا وید (یعنی الہامی
حکمت (طب) نے یونانیوں کو شفا بخشی، عربیوں کو قانون دیا اور
یورپ کو بایولجی بخش کر زندہ کردیا۔ چرا کا یہاں کا وہی بید ہے
جو عرصہ تک وہاں کا بقراط بنا رہا!

آریا ادب۔ ویدوں کے بعد آریوں کی وجاہت کا قصیدہ اُن کی
وہ نظمیں پڑھتی ہیں جو مہابھارت اور رامائن کی صورت میں دنیا کے اسٹیج پر نمودار
ہوئیں۔ یہ دونوں قصے عجیب اور اخلاق و شاعری میں آپ اپنی نظیر ہیں!
مہابھارت، چندر بنسیوں کا کارنامہ اور رامائن، سورج بنسیوں کا دوسرا شاہنامہ ہے!
مہابھارت کسی خاص فکر کا نتیجہ نہیں۔ اس کی تہذیب و ترتیب میں
متعدد دماغ لگے ہیں۔ اور صدیوں کی کوشش و کاوش کے بعد یہ اس درجہ
تک پہونچی ہے۔ ہر زمانہ کا ممتاز شاعر و فلسفی اپنا دینی فرض سمجھکر اسکی خدمت
کرتا رہا ہے۔ اور یہ سننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس مذہبی دفتر کی تدوین میں
غیر آریوں کا نجس ہاتھ بھی لگا رہا ہے۔ جیسے ہم بھاشا کے ذکر میں ذرا وضاحت سے
بیان کریں گے!

ایسی محنت کے بعد یہ جامع ضخیم و لاجواب نظم دنیا کے سامنے پیش ہوئی
اور کئی ہزار برس سے اپنا مقابل ڈھونڈھ رہی ہے! رامائن۔ والمیکی کی بے مثل
فکر کا بہترین نتیجہ اور ۴۸ ہزار اشعار کا مجموعہ ہے!

دنیا کی اور مشہور و معروف نظمیں جن کی زبان و خیالات پر کسی ملک
و قوم کو فخر و ناز ہو سکتا ہے اور جن کے ذریعے سے ہمارے دماغ و مزاج کی

پرورش واصلاح ہوئی اور جو مہابھارت ورامائن کے ساتھ پیش کیجا سکتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

(۱) ہومر (یونانی) کی ایلیڈ کئی سال کی محنت اور ۱۶ ہزار اشعار میں لکھی گئی۔

(۲) ورجل (لاطینی) کی ای نیڈ دس ہزار شعروں پر ختم ہوئی۔

(۳) فردوسی (فارسی) نے شاہنامہ تیس برس خون جگر کھا کر ؎

بسے رنج بُردم دراں سال سی | عجم زندہ کردم دراں پارسی

سلطان محمود کے زمانہ میں ۶۰ ہزار شعروں پر ختم کیا اور اس سے پارسیوں کی داستان پاستان ہی زندہ نہ ہوئی بلکہ ایران جی اٹھا۔ اور ایرانیوں[1] بلکہ کل فارسی داں ممالک و اقوام کا اس سے دماغ روشن ہو گیا!

---

[1] نقل ہے کہ فتح علی شاہ قاچار اور روسیوں کے درمیان ایک مرتبہ سخت جنگ ہوئی۔ فوجیں سرحد پر پڑی تھیں اور ایک شہزادہ کمان کر رہا تھا۔ روسی مغلوب ہوتے تھے۔ ایک رات حسب معمول شہزادے کی صحبت میں شاہنامہ پڑھا جانے لگا۔ داستان گو جس وقت ان اشعار ؎

چو فردا بر آید بلند آفتاب | من و گرز و میدان و افراسیاب
چنانش بکوبم بگرز گراں | چو پولاد کوبند آہنگراں!

تک پہونچا شاہزادہ جوش شجاعت میں اٹھ کھڑا ہوا اور خیمہ سے نکل کر اسی وقت دشمن کی فوج پر دھاوا کر کے انہیں پسپا کر دیا! (ناسخ التواریخ و تاریخ آل قاچار)

(۴) شیکپیر (انگریزی) نے اپنے بے نظیر ڈرامے، ملکۂ الزبتھ کے عہد میں تیار کئے۔ ان ڈراموں نے انگلستان کو ادب سکھایا اور انگریزوں کو مہذب بنا کر دنیا میں بڑھایا!

(۵) انیسؔ (اردو) نے اپنے مراثی پچاس برس کی عرق ریزیوں کے بعد اتمام کو پہونچائے۔ ان کا کلام اسّی نوے ہزار اشعار سے کم نہیں اور اور ہندوستانیوں[۱] کے ادب و اخلاق کی درستگی میں مہا بھارت و رامائن سے کچھ کم حصہ اس نے نہیں لیا ہے۔!

دنیا کے ان ساتوں، ممتاز و زندہ جاوید فلسفی و شعراء و معلمین اخلاق کے دماغوں کی ایک سی ساخت معلوم ہوتی ہے۔ انہیں زبان پر ایسی قدرت اور

---

[۱]۔ شیخ محمد جان شاد (مشہور شاعر لکھنوی) مرحوم ناقل تھے کہ غدر کے زمانہ میں میں پار (لکھنؤ) میں رہتا تھا۔ ضرورتاً ایک صبح کو قیصر باغ کی طرف آنا پڑا۔ انگریزوں اور باغیوں کی فوجیں پڑی تھیں۔ بیلی گارڈ کا محاصرہ تھا۔ اُس طرف سے جانے لگا۔ ایک بھنگی ہاتھ میں جھاڑو لئے کچھ سوچ میں کھڑا تھا مجھے دیکھکر بولا کہ میاں صاحب جان کی خیر مناؤ۔ اُدھر نہ جاؤ۔ میں نے کہا کیا خیر ہے؟ جواب دیا کہ گورے کمک کو آچکے۔ ہولاک اور جنرل اُٹرم بھی آہی چلے اور کیا کہوں ؎

(انیسؔ)

لاکھوں ہیں، کوئی قبل کوئی بعد آئے گا
گیتی ہلے گی، جب پسر سعد آئے گا!

جہاں کے بھنگیوں کا ادب و مذاق اتنا درست ہو گیا ہو۔ وہاں کے شائستہ کیسے ہوں گے؟ اور یہ انیسؔ کی زبان و شاعری کا صدقہ تھا!

ان کے خیالات میں اس درجہ وسعت نظر آتی ہے کہ ان کا کلام انسانی طاقت سے باہر معلوم ہوتا ہے اس ملک کی نشو و نما و پرورش میں لٹریچر (ادب) کا، بہت بڑا حصہ ہے۔ اور اس میں مہابھارت کو اولیت حاصل ہے۔ اس لئے اب ہم اس داستان کا خلاصہ پہلے پیش کرتے ہیں۔ اور پھر ملک و قوم پر اس کے اثرات کو بتا سکیں گے۔

مہابھارت - راجہ بھرت کی اولاد میں پانڈو اور دھرت (دھرت راشٹرا) دو بھائی ہیں۔ پانڈو اپنا راج پاٹ، دھرت کو دے کر جنگل میں نکل جاتے ہیں۔ ان کے سو بیٹے (کورو) اور پانڈو کی پانچ اولاد (پانڈے) ہیں راجہ دھرت بھتیجوں کے ولی بن کر نیک نیتی سے راج کرتے اور اپنے بڑے بھتیجے یدھشٹر کو یوراجہ (نائب ولیعہد) بناتے ہیں۔ کورو اس پر جلتے اور پانڈو کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اور یہیں سے بھائیوں کا بگاڑ چلتا ہے۔

کورو پانڈو کو نکلواتے اور جنگل میں ڈھکیلتے ہیں۔ وہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور ان کے ٹکنے کا جھونپڑا تک جلا دیتے ہیں۔ پانڈو جان لے کر بھاگتے اور آخر راجہ دروپد اکے ملک میں پناہ لیتے ہیں وہاں سوئمبر[۱] کی رسم

---

[۱] سوئمبر (سوئم = پسند۔ بر = دولھا) اگلے زمانہ میں یہاں کے راجاؤں میں دستور تھا کہ جب لڑکی (کماری) سیانی ہوتی تو اسکی خبر کرتے۔ ملک ملک کے کمار اس راجہ کے گھر آتے۔ ایک دن مقرر ہوتا جہاں سب جمع ہوتے اپنی طاقت کا امتحان دیتے۔ اُن میں جو پاس ہوتا اس کے گلے میں راجکماری بھرے جلسہ میں پھولوں کا ہار پہنا کر اسے اپنا شوہر بنا لیتی!۔

ادا ہوتی ہے۔ میدان میں ایک لمبی کڑی کھڑی ہے۔ اس کے سر پر ایک چرخی گھوم رہی ہے۔ چرخی کے بیچ میں سونے کی ایک مچھلی لٹکی وہ بھی اس طرح چکر کھا رہی ہے کہ نظر نہیں ٹھہرتی۔ ایک طرف ایک کڑی کمان دھری ہے شرط ہے کہ جو اس کا چلّا چڑھائے اور پہلے ہی نشانہ میں مچھلی کی آنکھ اڑائے (چھیدے) وہ راجہ کی خوبصورت بیٹی دروپدی کو پائے!

ملک ملک کے شہزادے اور دور دور کے کمار آئے ہوئے ہیں۔ مگر اس فولادی کمان کو دیکھ کر کانپتے اور نشانہ کے خطا ہونے کی رُسوائی کو یاد کر کے تھراتے ہیں۔ کسی کا ہیاؤ نہیں پڑتا۔ سب مورت بنے کھڑے ہیں آخر پانڈوں میں سے ارجن اُٹھتا، کمان اُٹھاتا، چلّہ چڑھاتا، نشانہ لگاتا اور اس مچھلی کو گراتا ہے۔! اس پر دربار دھک سے ہو جاتا اور جلسہ میں سناٹے آ جاتا ہے۔ دروپدی، بڑھتی آگے آتی اور اپنے جیتنے والے کے گلے میں ہار پہنا کر اس کی ہو جاتی ہے!

اس کا چرچا پھیلتا اور کوروؤں کو اور بھی حسد ہوتا ہے۔ مگر راجہ دھرت منصف ہیں۔ بھتیجوں کی قدر کرتے بلاتے اور آدھا راج پاٹ ان کو لکھ دیتے ہیں۔ پانڈے چچا کے پیر چوم کر رخصت ہوتے اور ایک جنگل کو صاف کر کے اُسے اندر پرست[۱] (دلّی) بناتے اور اپنی بستی الگ بساتے ہیں۔

---

[۱] اندر پرست (اندر پرستھا) دلّی کا بہت پرانا نام = اندر عیش کے دیوتا ہیں اور پرستھ بمعنی اونچی چورس زمین۔ یعنی عیش گاہ!

سب طرف امن چین ہے۔ مگر کورو آرام سے نہیں۔ اندر پرست کا شہر اور پانڈو کا نام سن کر اور بھی جلتے ہیں۔ انہیں دعوت دے کر بلاتے اور کسی طرح یدھشتر کو بہکا کر انہیں (پانڈو) جوے پر لگاتے اور دغا کا پاسا پھینک کر سب کچھ ان کا چھین لیتے ہیں۔ جواری کی جھل مشہور یدھشتر اب بھائیوں پر بازی لگاتے اور ایک ایک کر کے انہیں بھی ہار جاتے ہیں۔! مطیع بھائی اُف نہیں کرتے اور بڑے کا حکم خدا کے فرمان کی طرح مانتے ہیں! کورو اس پر بغلیں بجاتے، خوشی کا نرسنگھ پھونکتے، آوازے کستے اور یدھشتر کو تیہا دلاتے ہیں!

ہارا جُواری جان پر کھیلتا ہے۔ یدھشتر اب اپنی چہیتی اور جیتی ہوئی رانی درو پدی (جو پانچوں بھائیوں کی بیوی ہیں) کو داؤں پر رکھ دیتے ہیں! پاسہ بدی کر رہا ہے۔ کسی طرح نہیں پلٹتا۔ اور یدھشتر آخر انہیں بھی ہار کر اور ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔!

کورو درو پدی کو ذلیل کرتے، ان کے بال پکڑ کر کھینچتے اور اُس بھری محفل میں انہیں ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔

راجہ دھرت اب تک چپ تھے مگر عورت ذات اور گھر کی عزت اور بھتیجوں کی ناموس کو اس طرح نہ دیکھ سکے۔ جُوئے پر ملامت کرتے، بیٹوں کو ڈانٹتے، بھتیجوں کو چھڑاتے اور اُن کا راج اُن کے حوالے کر کے رخصت کرتے ہیں

کورو اب بھی نہیں بیٹھے۔ کچھ ہی دنوں بعد، سادہ دل یدھشتر کو پھر پھانستے اور جوئے کا دام پھر بچھاتے ہیں۔ کورو جیتتے اور پانڈے

پھر ہارتے اور آخر بارہ برس کی بن باس لیتے ہیں۔

اس میعاد کے گذرنے اور دنیا کی ٹھوکر کھانے کے بعد پانڈے سنبھلتے اور ایک جرار لشکر لے کر کوروؤں پر چڑھتے ہیں وہ بھی اپنی ٹڈی دل فوج لیکر اُدھر سے بڑھتے ہیں۔ ملک بھر کے راجہ سمٹ آتے اور اِدھر یا اُدھر ہو جاتے ہیں اور ہستنا پور[1] کے میدان میں بھائیوں بھائیوں میں (مہابھارت کی) لڑائی چھڑ جاتی ہے۔ دونوں فوجیں بھڑتی، ٹکراتی اور دنیا سر پر اٹھا لیتی ہیں۔ اٹھارہ دن آسمان چکر میں۔ اور زمین بھونچال میں رہی وہ خاک اڑی کہ سورج زرد اور چاند گرد ہو گیا۔ یدھشٹر[2] کے نیزے نکل کے گھوڑے، اسہہ دیو کی تیغ، بھیم کے گرز اور ارجن کے تیروں اور پھر سری کرشن جی[3] کی دعاؤں نے دشمن پر آگ برسا دی۔ وہ رن پڑا کہ الاماں! کورو ساتھی سمیت کھیت رہے اور پانڈے مردی کا نشانہ اڑاتے ہستنا پور پہنچے اور سارے راج کے مالک ہو گئے

بڈھے راجہ بھرت اب تک جی رہے تھے۔ مگر بیٹوں کے غم میں اندھے اور چور چور ہو گئے تھے۔ دل کسی حال بہلتا اور ٹھہرتا نہ تھا۔ آخر بی بی اور بھاوج کا ہاتھ پکڑ جنگل کی طرف نکل گئے اور وہاں پاؤں پھیلا کر ہمیشہ کیلئے سو گئے

۱؎ ہستنا پور کے کھنڈر دلی سے ۲۵، ۳۰ کوس (اتر پورب) اب بھی دکھائی دیتے اور یدھشٹر کی اس راج دھانی کو یاد دلا کر مہابھارت کی مشہور لڑائی کا نقشہ پیش کر دیتے ہیں ۲؎ یہ پانچوں بھائی ان پانچ فنوں میں طاق سمجھے جاتے تھے۔ ۳؎ سری کرشن جی دیوتا بھی ہیں اور پانڈوؤں کے رشتہ دار بھی۔ اس لڑائی میں ان کی ادھر موجودگی فتح کی ضامن تھی

یہاں پانڈے گو راج رج رہے ہیں مگر دل چین سے اور دماغ آرام سے نہیں۔ ایسی لڑائی اور ایسے خون کا سماں ہر وقت آنکھوں میں پھر رہا ہے جی چھوٹا اور دل بیٹھا جاتا ہے۔ ایک دن دنیا کی بے ثباتی کا ذکر نکلا اور اس نے ایسا اثر کیا کہ پانچوں بھائی راج پاٹ چھوڑ فقیری لیتے اور دروپدی سمیت بنوں میں جا رہتے ہیں۔ اور وہاں تپیشیا کرتے اور اندرا کی یاد میں دن گزارتے ہیں!!

اور بھائی تو اس رستے ہی میں گزر گئے مگر یدھشترا اور انکا وفادار کتا کسی طرح جیتے جی اندرا کی جنت تک پہونچے۔ ان کے لئے دروازہ کھلا۔ لیکن بھائیوں اور بی بی کے بغیر انہوں نے اندر جانا گوارا نہ کیا۔ انکی خاطر رکھی گئی۔ اور انکی بخشایش بھی ہوئی۔ مگر یہ اب اپنے کتّے کے لئے اڑے ایسا جانور جنت میں کس طرح جاتا؟ یہ عرض قبول نہ ہوئی۔ دونوں رکے اور انہیں وہاں کی خالی ایک جھلک دکھا کر جہنم میں پھینک دیا گیا۔ اس اکیلی جنت سے بھرے جہنم کو انہوں نے بہتر سمجھا۔ اس حال میں بھی خوش رہے۔ آخر آزمایش اور مصیبت کے دن کٹے قصور معاف ہوا۔ سب کے سب بہشت میں پہونچائے گئے اور یوں دائمی سرور اور حیاتِ ابدی حاصل کر کے مگن ہو گئے!!

یہ مہابھارت کا خلاصہ ہے۔ اِس حکایت کے ساتھ بیچ بیچ میں اور قصے بھی نکلتے ہیں اور وہ بھی لطائف و نصائح سے خالی نہیں۔ مہابھارت کو محض بوستانِ خیال تصور نہیں کرنا چاہئے۔ اس میں علم و حکمت کے ذخائر

ہیں کہ جوہری آنکھوں سے لگاتے ہیں۔

یہ داستان ہمیں راجہ دھرت کی سچائی اور امانت داری کا سبق دیتی اور باتوں باتوں ہی میں حسد و نفاق اور بھائیوں کی لڑائی کے بد نتیجہ کو ظاہر کرتی ہے۔ سوئمبر کی رسم سے انسان کی فضیلت کا معیار صرف قابلیت کو ٹھہراتی اور عورتوں کو اپنے شوہروں کے انتخاب میں اُن کی جائزہ آزادی کو سراہتی اور آج سے کئی ہزار برس قبل کی متمدن اور شائستہ ہندی عورتوں کے سوشل درجہ کو بتاتی ہے! پھر جوئے کی برائی کو کھول کر اُس کے نتیجہ کو آئینہ کر دیتی ہے۔ یہ داستان، فتح و شکست کو جمعیت سے نہیں بلکہ بہادری سے متعلق کرتی اور سری کرشن جی کا قدم بیچ میں لا کر حق کی فتح کو نمایاں کر دیتی ہے۔ اتنے قصور کے بعد دنیاوی وجاہت کو ضروری منواتی اور مذہب کے رشتہ سے اُسے وابستہ بتاتی ہے۔ مگر ساتھ ہی اصل زندگی کو بھی کسی حال بھولنے نہیں دیتی ہے۔ اس عالم کو سراب اور یہاں کی واردات کو خواب سے تعبیر کر کے اُس کی وقعت کو گھٹاتی اور راجہ دھرت کو جنگلوں میں لے جا کر اور پھر پانڈوں سے راج چھڑوا کر، آلائش دنیا سے روح کو پاک کرنے کا رستہ دکھاتی ہے! کتے کا ذکر بھی حکمت سے خالی نہیں **وفا** کا جواب وفا سے دیا جاتا ہے۔ اور اُس کے قائم رکھنے میں آزمائشوں کا مقابلہ کرنا سکھایا جاتا ہے! اور پھر اس کے صلے میں حیاتِ ابدی اور دائمی سرور عطا کیا جاتا ہے!!

مہا بھارت کے بعد رامائن کا درجہ ہے اور اس لاجواب نظم نے بھی یہاں کے دماغ کی نشو و نما و پرورش میں بڑا حصہ لیا ہے اور جب بابا تلسی داس نے یہاں کی خاص زبان یعنی بھاشا میں بھی اس کا ترجمہ کر دیا تو یہ گھر گھر

پھیل کر زبان زد خاص وعام ہوگئی۔ اب اس کا خلاصہ بھی پیش کر کے ملک و
قوم پر اس کے اثرات بیان ہوں گے۔

رامائن۔ کہتے ہیں کہ کوسل[1] کے راجہ دسرتھ کی تین رانیاں تھی اور ان سے چار اولاد ہوئیں۔ کوسیلا کو اللہ نے رام چندر نام ایک چاند سا بیٹا دیا۔ کیکئی کی گود بھرت سے بھری گئی۔ اور سمیترا کی آنکھ لچھمن اور ستر گھن سے ٹھنڈی ہوئی!

جس باغ میں ایسے پھول کھلیں اس کی بہار کا کیا کہنا یوں تو یہ چاروں کوسل کی زیب اور راج کی زینت تھے مگر رام کی بات ہی کچھ اور تھی۔ بچے کے پیر پالنے میں۔ اسی وقت سے ان کے آثار دوسرے تھے۔ سب ان پر فدا ہے اور لچھمن تو ان بھائیوں پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ ان دونوں کا نام (رام لچھمن) ساتھ آتا اور ان کے عشق کو بتاتا ہے۔

رام بڑے ہوئے تو اور فنوں کے ساتھ تیر اندازی میں بھی ارجن نکلے ایسی ہنر اور شوق انہیں راجہ جنک[2] (متھلاپور) کے سوئمبر تک لے گیا۔ جہاں بھرے

---

[1] کوسل گھاگھرا (دریا) کے کنارے ایک بڑی آبادی تھی۔ اور سورج بنسیوں کی وہیں راج دھانی تھی۔ اس جگہ کا نام بعد کو اجودھیا اور اودھ پڑا۔ اس کے کھنڈر اب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے ذرا ہٹ کر فیض آباد آباد ہوا۔ [2] جنک پور۔ سیتا جی کے باپ راجہ جنک کی راجدھانی ترہت (شمالی بہار) کے علاقہ میں یہ ایک مشہور جگہ تھی۔ اسے متھلاپور بھی کہتے ہیں۔

جلسہ میں انہوں نے وہ کمان توڑی جو کسی بشر سے آج تک اٹھی بھی نہ تھی۔ اس کے عوض سیتاجی کو جیت لائے۔ اور وہ حسن و وفا کی دیبی ان کے جان کے برابر رہی!

دستور تھا کہ راجہ بوڑھا ہوتا تو سلطنت کے کام میں کسی لائق بیٹے اور عزیز کو شریک کر لیتا۔ وہ یودراجہ کا خطاب اور اسی وقت سے تربیت پاتا۔ راجہ دسرتھ بھی جب بوڑھے ہوئے تو یودراج کی فکر ہوئی۔ بھائی بند، رشتہ دار نوکر چاکر، رعیت پرجا آئے گئے۔ سب کی نظر انہیں رام پر تھی۔ راجہ بھی یہی چاہتے تھے۔ مگر رائے سب کی لی۔ اور سب نے ایک منہ ہو کر رام، رام ہی کہا! راجہ شاد ہوئے، بیٹے کو بلا کر خوش خبری سنائی۔ اور اسی وقت سے اس رسم کی ادائیگی اور جشن کی تیاری ہونے لگی!

رنگ میں بھنگ۔ رنواسوں (محلات) میں بھی اس کا چرچا ہوا۔ ہر طرف شادی رچی۔ مگر رانی کیکئی کے گھر ماتم تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ رام آج یودراجہ (نائب) اور کل راجہ بنے تو کوسیلا (سوت) کا راج اور میرا برا دہاڑا ہوگا۔ اور جب تک بھرت گدی نہ پائیں، میری کوئی شنوائی نہ ہوگی۔ یہ سوچ کر وہ اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ رہیں۔ راجہ رات کو اندر آئے تو رانی کو پڑا دیکھ کر گھبرائے حال پوچھا۔ کچھ نہ کھلا۔ بہت اصرار کیا تو بولیں کہ مہاراج آپ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ جو دو باتیں تم چاہو گی ہم پوری کریں گے۔ اس کا وقت آگیا۔ اب قول پورا کیجئے۔ راجہ کیا جانتے تھے کہ کیا کہا جائے گا؟ جواب دیا کہ ہاں، ہاں، وہ کون سی بات ہے جو تم کہو اور پوری نہ ہو۔ کیکئی تڑپ کر

بولی کہ بھرت کو راج اور رام کو بن باس ملے۔

بن باس ۔ یہ سن کر راجہ دھک سے ہو گئے۔ صبح ہوئی۔ آج جشن کا دن اور بڑی تیاریاں تھیں۔ شہر میں چہل پہل، اور محل میں غل[1] غپاڑا تھا۔ دربار تیار اور درباری بے چین کہ مہاراج جلد باہر آئیں اور رام گدی پائیں۔ بڑی دیر ہوئی۔ اندر خبر گئی۔ راجہ نے بیٹے کو بلایا اور ماجرا کہہ سنایا۔ راج کا وارث پاؤں پر گر کر بولا کہ مہاراج زبان ہار چکے! یہ کہتے ہوئے ماں اور بی بی کے پاس گئے۔ حال کہا اور بن باس پر تیار ہو گئے۔ سیتا اور لچھمن انہیں اکیلا کیونکر چھوڑتے۔ دونوں ساتھ ہوئے اور تینوں نکلے۔ محل ویران اور شہر سنسان ہو گیا۔ ایک خلقت ٹوٹی۔ اور اپنے شہزادے کو شہر کے ناکے تک پہونچا آئی!

راجہ کو غموں نے کھایا اور وہ بھی تمام ہوئے! یہ سب یہاں ہو گیا مگر بھرت کو کچھ خبر نہیں۔ وہ پنجاب میں تھے۔ ادھر سے چٹھی گئی تو گھبرائے اور دوڑے آئے۔ سارا حال سنا۔ بڑا رنج ہوا۔ ماں سے بھی بیزار ہو گئے۔ سب نے گدی پر بیٹھنے کو کہا۔ انکار کیا بھائی (رام) کی ڈھونڈھ میں نکلے۔ چترکوٹ[2] (پہاڑ) پہونچے، ملے۔ گھر چلنے کو کہا۔ انھوں نے باپ (راجہ) کی بات یاد دلائی۔ نصیحت کی کہ قول پورا ہونے میں تم بھی میرا ساتھ دو۔ بھرت چپ ہو گئے۔ چودہ برس بعد

---

[1] غل غپاڑا۔ گھما گھمی کے معنوں میں۔ نہ معلوم اور جگہ کیونکر بولتے ہیں۔ ہماری زبان پر یہ لفظ اسی طرح اور انہیں معنوں میں چڑھا ہوا ہے! [2] چترا کوٹ۔ بندیلکھنڈ کا ایک پہاڑی مقام کوٹ چھوٹے قلعہ کو کہتے ہیں۔ رام چندر جی۔ مدتوں یہاں بھی رہے۔

اجودھیا واپس آنے اور راج لینے کا قول لیکر پلٹے اور بھائی (رام) کی کھڑاویں چوم کر خالی تخت پر رکھی اور انکی طرف سے راج کرنے لگے۔!

دکھن کا فسانہ

رام، لچھمن، اور سیتا کوسل سے نکلکر پراگ (قدیم الہ آباد) اور وہاں سے دھندیا چل کے بنوں میں جا رہے۔ اور پھر چترکوٹ کی پہاڑی پر جو پڑاڈ الکر بیٹھے، جی گھبرایا تو آگے بڑھے۔ جنگلوں کی ہوا کھاتے۔ بناس پتی چباتے بنوں کو صاف اور وحشیوں کو رام کرتے دریائے گوداوری کے کنارے جا کھڑے ہوئے اور اُسے پیر کر دکھن کی چھاتی پر سوار ہوئے اور نسک[1] (پنچ وٹی) میں ڈیرے ڈال دیئے۔

یہ علاقہ لنکا (سیلون) کے راجہ راون کا تھا اور اس کے بھائی کھر اور وشن[2] وہاں کے حاکم تھے۔ سروپ نکھا ان کی بہن اُس علاقہ میں آتی جاتی تھی

---

[1] نسک ـ سانسکرت میں 'نسک' ناک کی جگہ کو کہتے ہیں۔ لچھمن جی نے سروپ نکھا کی یہیں ناک کاٹی اور جب سے وہ جگہ نسک ہو گئی! [2] فردوسی کے اس مصرعہ کو یاد کرو۔ ع
مانند سان گیتو، در جنگ لشن! اور پھر وشن کے قافیہ سے اسے ملاؤ۔ ہند و فارس کے نام تک اس طرح ملتے جلتے ہوئے ہیں اور یہ وہی سانسکرت وژند کے ایک ہونے کا سبب ہے ایک فلالوجسٹ (ماہر علم اللسان) اس سے بڑے نکتے حل کر سکتا ہے!

پھرتے پھراتے ایک دن اِدھر بھی نکل آئے۔ اور رام چندر جی کو دیکھکر جی جان سے اُن پر عاشق ہو گئی۔ اِس چاند کا چکور بنی مدتوں منڈلاتی اور جان بچھاتی رہی۔ مگر سیتا جی کا گرفتار کیا پھنستا! اس بھتنی کو یہ ہمیشہ دھتکارتے رہے اس کی دیوانگی حد سے بڑھی تو لچھمن جی نے عاجز آ کر اس چڑیل کی ناک کاٹ اپنی سرحد سے اُسے دور پھینک دیا!

سروپ نکھا روتی پیٹتی اسی حالت سے بھائیوں کے پاس پہونچی۔ بہن کا یہ حال دیکھکر بھائی بپھرے اور ایک لشکر لے کر اُن مسافروں پر ٹوٹے اِدھر دو اور اُدھر ہزار۔ مگر یہ (رام لچھمن) جان پر کھیل کر اور دل کھول کر لڑے کھر اور دشمن ان کے تیروں سے چھنی ہو کر گرے۔ یہ جیتے اور پھر اس جنگل میں شیر بن کر رہے!

سروپ نکھا کا یہ وار بھی خالی گیا تو اور جھلائی اور دوسرے چر تر پر کمر باندھی۔ لنکا پہونچی۔ آگ لگائی۔ راون سے ملی اور کہا کہ تیرے علاقہ کے بھاگ کھلے۔ لے اندرا کی بیٹی اور حسن کی دیبی زمین پر اتر آئی اور نسک کے جنگل میں منگل منا رہی ہے۔ راجہ ہم نے تو اُسے دیکھتے ہی غش کیا۔ بڑی فکر کی کہ تجھ تک اُسے لائیں۔ مگر دو آسیب اُس کی جان نہیں چھوڑتے۔ بلا کی طرح چمٹے ہوئے ہیں۔ ہم عورت ذات اُن سے کیسے جیتتے۔ دیکھ تیرے بھائیوں نے جان اور ہم نے تیرے کارن ناک تک کٹوائی مگر وہ ہاتھ نہ آئی۔ راجہ! اب تم جاؤ۔ اسے لاؤ اور بی بی بناؤ۔ مگر دیکھنا۔ وہ دونوں سانپ ہیں اور عورت بھی ناگن سے کم نہیں۔ ہشیاری سے جانا اور اُسے اڑا لانا!

راون یہ سنتے ہی بے چین اور بن دیکھے سیتا کا عاشق ہو گیا۔ لنکا سے چلا، لنک پہونچا اور فقیروں کا بھیس کر ایسے وقت سیتا جی کی جھوپڑی تک آیا کہ رام، لچھمن دونوں شکار کو نکل چکے تھے۔ اور وہ باہر زمین پر کنڈل[1] مارے (کہ کوئی دشمن اندر نہ آسکے) اکیلی بیٹھی مالا جپ رہی تھیں۔ یہ پہونچا اور صدا لگائی کہ بھوکھا ہوں۔ راہِ خدا کچھ دیدے! سیتا جی تڑپ گئیں۔ ہاتھ بڑھا کر بھوکے کو روٹی دینے لگیں۔ وہ بولا۔ فقیر کتا نہیں۔ آدمی ہے یہ چھوت اچھا جاتا ہوں۔ یہ بے چین ہو کر حصار سے باہر نکل آئیں۔ اور فقیر کی جھولی بھرنے لگیں۔ موقعہ ملا وہ بھوت انہیں پکڑ، پیٹھ پر لاد، جنگلوں میں گھس گیا۔

رام لیلا[2]

یہ دونوں بھائی (رام لچھمن) شکار سے آئے تو سیتا جی کو جھوپڑی میں نہ پا کر بہت گھبرائے۔ ڈھونڈھنے نکلے۔ پہاڑ پہاڑ جنگل جنگل، مارے پھرے۔ پیر میں چھالے پڑے۔ مگر کہیں ٹھکانا نہ ملا اور گھبرائے۔ آخر کسی طرح اصل حال کھلا اور یہ دونوں لنکا کو پہونچنے نکلے! لنک سے اتر کر راجہ سگدیو (سگریو)

---

[1] کنڈل مارنا۔ منتر یا دعائیں پڑھ کر زمین پر ایک دائرہ (سرکل) کھینچتے اور اسکے اندر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی کو حصار کھینچنا بھی کہتے ہیں۔ خیال ہے کہ اس کے اندر بھوت پلیت (پلید) اور دشمن نہیں آسکتا! [2] رام لیلا۔ لیلا بمعنی تماشہ۔ یہ کھیل سارے ہندوستان میں سالانہ ہوا کرتا ہے۔

غیر آریا) کا علاقہ تھا۔ وہ ان پر مہربان ہو گیا۔ اور کوسل کا راجہ ہان کران کی بڑی آؤ بھگت کی۔ حال سن کر فوج دی۔ اور ہنومان[1] کو سالار بنا کر ساتھ کیا سب نکلے۔ سمندر کنارے پہونچے۔ پانی زمین کاٹ کر ہند و لنکا کو دو کئے ہوئے تھا۔ ہنومان نے پل باندھ کر ایک کیا۔ فوج ادھر چھوڑ کر اُدھر اترا اور سیتا کی خبر لینے چلا۔

وہاں راون نے سیتا کے لئے نیا محل اور باغ بنوا کر اس میں انہیں بکاؤلی کے پھول کی طرح رکھا تھا۔ اُن کے پاس جاتا عشق جتاتا، دام بچھاتا، وہ حسن سے سب کاٹتیں۔ اسے گرفتار رکھتیں۔ مگر آگے نہ بڑھنے دیتیں۔ اور رام کی یاد میں بیٹھی دن گزارتیں!

ہنومان اُدھر پہونچا۔ بھیس بدل کر کسی طرح اس محل میں گھسا۔ سیتا جی سے ملا۔ حال کہا۔ اُن کے بیٹھے ہوئے دل کو اُٹھا کر لوٹا۔ اور رام سے سارا قصہ کہا۔ اب ادھر سے فوج چلی۔ لنکا پر چڑھی۔ راون بھی نکلا۔ لڑائی چھڑی اٹھارہ دن رات خون کی ندی بہی۔ سگدیو کی فوج اور راون نے بڑا کام کیا

---

[1] اس زمانہ میں آدمیوں کے نام بھی۔ اکثر جانوروں کے نام پر ہوا کرتے تھے ہندوستان ہی میں نہیں، ایران و شام میں بھی اس کا رواج تھا۔ خاندانوں کے نام جیسے ناگ بنسی، والمیکی نے ایسے ناموں سے شاعرانہ انداز پیدا کرلئے

لنکا میں جو تھا سو باون گز کا[1]۔ مگر اب بالشتیوں[2] سے بڑھ کر نہ تھے۔ سب ٹکڑے ٹکڑے ہوئے۔ ایک جیتا نہ چھوٹا۔ راون بھی گرا اور خاک میں ملا۔ لنکا میں آگ لگی، سارا شہر جلا اور پھنکا! رام لچھمن ہنستے محل میں آئے۔ سیتا بال کھولے کھڑی اُن کے لئے دعا کر رہی تھیں۔ ایک نے دوسرے کو دیکھا ملے خوشی کے آنسو برسائے۔ رانی کا ڈولا اپنی فوج میں لائے! ہنومان کی پیٹھ ٹھونکی، راجہ سگدیو کا شکریہ ادا کیا۔ چودہ برس کٹ چکے اور مصیبت کے دن نکل چکے تھے دکھن کو سلام اور غیر آریوں کو رخصت کر کے دونوں بھائی رانی سمیت کوسل کو چلے کہ بھرت سے ملیں اور وعدہ پورا کریں۔

بھرت مِلاپ!

خبر چھپی نہ رہی۔ کوسل نے بھی پردیسیوں کی واپسی کا حال سُنا۔ کوسیلا جی اُٹھیں۔ بھرت شادی مرگ ہو گئے۔ سارے شہر میں ایک عید تھی۔ مندروں شوالوں میں گھنٹے بجتے۔ ایک دوسرے سے ملتے اور مبارکی دیتے۔ بھرت سب کو لے کر بھائی سے ملنے نکلے۔ سارا شہر ٹوٹا۔ آدمی پر آدمی

---

[1] لنکا میں جو ہے سو باون گز کا۔ شاید جب ہی سے یہ مثل چلی آتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم قد آور اور گراں ڈیل تھی۔ اور جب ہی دیو لقب ہوئے۔

[2] بالشتئے لنکا والوں کے جواب میں یہ بھی شاعرانہ پہلو لئے ہوئے ایک قوم مانی گئی ہے۔ جیسے انگریزی میں للی پوتین۔

گھوڑوں پر گھوڑے، رتھ پر رتھ، پیچھے پیچھے، گیندا (پھول) اچھالتے، ابیر[1] اڑاتے ناکہ تک پہونچے، رام لچھمن اُدھر سے بڑھے۔ بھرت دوڑے۔ بھائی کے پیر چومے۔ انہوں نے اٹھایا، گلے لگایا۔ اور اب تینوں ایک رتھ میں بیٹھ اور سیتا کو دوسری میں بٹھا، سونے کے پھول مٹھیوں سے پھینکتے، زر اچھالتے، جواہر وارتے محل تک پہونچے۔

کوسلا وڑین، سمیترا بڑھیں، کیکئی بھی آئیں۔ سب ملے روئے اور پھر جشن تازہ ہوئے۔ محل سجایا گیا اور دربار لگایا گیا رام آج گدّی پائیں گے۔ بڑی بھیڑ بڑا اجماؤ اور بڑی گھما گھمی تھی۔ رام، لچھمن، بھرت، ستر گن چاروں بھائی ساتھ آئے۔ اپنے اپنے عہدوں سے بیٹھے۔ بھرت بڑھے۔ بھائی (رام) کا ہاتھ پکڑ مسند تک لائے۔ بٹھایا! مبارک سلامت کی دھوم مچی سنکھ پھکنے اور گھنٹے بجنے لگے۔ اس دھوم دھام میں راجہ دسرتھ سب کو یاد آگئے۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اُن کے چرچے بھی رہے۔ برہمن بھی آئے۔ راجہ (سرگ باشی) کے نام پر دان ہوا۔ اور پھر ریت رسم ادا ہونے اور خوشی کے باجوں سے مستی چھانے لگی۔ چھٹی ہوئی تو ایک گھوڑا لایا اور بل[2] دیا گیا۔ اور دربار برخاست ہوا۔

لہ۔ ابیر۔ الف سے اس کا املا ہو تو ہندی اور عین سے عربی لفظ ہے۔

لہ۔ کسی بڑی کامیابی اور خوشی کے موقعہ پر گھوڑے کی قربانی (بل) کا رواج تھا۔

سیتاجی!

چودہ برس بن میں رہ کر اور دنیا کی کڑیاں جھیل کر، رام چندر اور سیتاجی اور بھی پکّے اور ایک دوسرے کے غلام ہوگئے تھے اور بڑے چین سے رہتے تھے۔ مگر زمانہ کا بُرا ہو۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ملک میں ایسا کال پڑا کہ اناج خواب ہوگیا۔ اور آدمی آدمی کو کھانے لگا۔!

راجہ (رام چندر) گھبرائے۔ پنڈتوں، جوتشیوں کو بلایا۔ پوچھا کچھ نہ کھلا ہارے تو لگے وجہ آپ سوچنے۔ جنگل کے دن اب تک یاد تھے۔ وہاں کا خیال آتے ہی راون کی تصویر سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس تصویر میں وہ باغ بھی نظر آیا جہاں سیتاجی نظر بند تھیں۔ اُس باغ اور اُس قید نے بڑے شک ڈلائے اور سیتا کی طرف سے دل میں کھٹک سی ہوگئی! اور ایسے کال کو اسی کا نتیجہ اور اُدھر کا غصہ سمجھے! اندر آئے۔ رانی (بی بی) کو بلایا۔ پوچھا۔ قسم دلائی۔ وہ جو چودہ برس ان کے لئے بن باس رہی ہو ایسی بات کا کیا جواب دے؟ منہ دیکھتی رہیں! مَرد کا غصہ توبہ اُف۔ آگ میں ڈالی گئیں! بے لاگ نکل آئیں۔! اس پر بھی یہ (رام) ٹھنڈے نہ ہوئے۔ اُن کو بن باس کا حکم ملا۔ رانی، اکیلی جنگل میں پہونچائی گئیں۔ وہاں رہیں۔ دن پھرے تو گھر آئیں کوئی شکایت زبان پر نہ لائیں اور پھر میاں، بی بی اسی طرح ہنستے بولتے اور اچھے دن گزارتے رہے!!

یہ خلاصہ والمیکی کی اصلی تصویر کا تو کیا، ہاں دور سے اسکی ایک جھلک دکھا سکتا ہے۔ رامائن چھ حصوں میں ہے۔ اس کے پہلے دو حصے تک دلیس کے آریا راجاؤں کے یہاں قیام وسلطنت اور خصوصاً سورج بنسیوں کے ذکر خیر میں وقف ہیں۔ باقی حصوں میں دکھن کی سرگذشت غیر آریاؤں سے ملنا، ان کی کمک اور ان سے لڑائی اور پھر راون سے جنگ۔ لنکا کی فتح اور شمال و دکھن کے تعلقات قائم ہو جانے کا حال اور پھر سیتا جی کے قابل تقلید کیرکٹر کا صراحت سے بیان ہے۔

یہ قصہ راجہ دسرتھ کی سلطنت میں عام مشورے کی شرکت دکھا کر اس وقت کے طرزِ حکومت کو واضح کرتا ہے۔ اور رانی کیکئی کے پردے میں تریاہٹ اور سوتیا جلن کو دکھاتا اور رام کے لباس میں زبان کا پاس اور وعدہ کی پابندی کا سبق دیتا ہے۔ اس حکایت میں لچھمن ہم کو بھائیوں کے سلوک و مدارا، اور آپس کی وہ اگلی محبتیں اور بے ریا خدمتیں یاد دلاتے ہیں۔ جو اب خواب ہو گئیں! بھرت باپ کا ادب اور بڑے بھائی کا پاس سکھاتے اور سلطنت و خاندان کے حفظ کی صورت بتاتے ہیں۔ رانی کوسیلا، شوہر کی بات پر ایثار و صبر دکھاتی اور بیٹے کو جنگل میں رخصت کرکے نفس کشی کا سبق پڑھاتی ہیں!

دکھن کا فسانہ بہت دور لیجاتا اور آریا و غیر آریا میں ارتباط اور انکی مضبوطی کا حال کھولتا۔ اور اس سے دونوں طرف (شمال و دکن) جو اثرات پڑے انہیں واضح کرتا ہے!

اس فسانہ کی اصل ہیرو، سیتا جی ہیں۔ اور والمیکی نے انہیں محض
ایک دیبی کے پیکر میں نہیں بلکہ ایک معمولی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ
راجہ کی بیٹی، راجہ کی بہو اور کمار کی بی بی ہیں۔ اور بڑے ناز و نعم کی پلی
ہیں۔ مگر شوہر پر بُرا وقت آتا تو منہ نہیں موڑتیں اور اس کے لئے ہر کڑی
اُٹھانے پر کھڑی ہو جاتی ہیں! دکھن میں ظالم راون کے قابو میں ہیں۔
مگر اُسے پھنسائے اور خود کو ہر طرح بچائے رکھتی ہیں۔ اور اس سے اپنی
عقل و مذہب کا ثبوت دیتی ہیں۔

اس قصہ کا آخیر حصہ بھی کچھ کم دلکش اور سبق آموز نہیں۔ سیتا جی
شوہر کا بیجا غصہ اٹھاتیں اور ان کے غلط فیصلہ کو سر جھکا کر مانتی ہیں اور
راہِ محبت میں اُف نہ کر کے دنیا پر اس محبت کا راز کھول دیتی اور چلنے
والوں کے لئے اپنا نقش قدم چھوڑ جاتی ہیں!!

مہابھارت و رامائن کا مجموعی اثر۔ مہابھارت و رامائن دونوں
سنسکرت میں تھیں۔ اس لئے عوام پر ان کا کافی اثر پڑنا مشکل تھا۔ تقریباً
ڈھائی سو سال قبل مسیح سے یہاں (ہند) ایک دو طرح کے حروف ایجاد
ہو گئے تھے۔ اور ان میں کچھ تحریر بھی ہوا کرتی تھی۔ مگر عام طور پر لکھنے کا
رواج نہیں ہوا تھا[1]۔ برہمن مذہبی کتابوں کی تحریر سے زیادہ ان کا حفظ کر لینا

---

[1] ویبر۔ مشہور جرمن لیکچرار۔

پسند کرتے تھے۔ اور نظم کی وجہ سے یہ آسان بھی تھا انہوں نے مذہبی رسموں اور شادی غمی کی روایتوں میں ان (مہابھارت و راماین) کے منترے اور اشلوک پڑھنے کا رواج ڈالا۔ اور چوں کہ ان میں مذہبی خصوصیات کے ساتھ عمدہ پیرائے میں نصائح اور دلکش قصّے اور اور لطائف بھی تھے اس وجہ سے انکی طرف رغبت ہوتی چلی اور خاص موقعوں کے سوا یوں بھی وہ دہرائے جانے لگے۔

ان پنڈتوں کی تقلید پر یہاں ایک اور فرقہ کھڑا ہوا جو بھاٹ[1] کہلاتا تھا۔ یہ نیچے طبقے کے لوگ اور زیادہ تر غیر آریا اور عوام تک بآسانی پہونچ سکتے تھے۔ انہوں نے بھی اُن منتروں کو یاد کیا اور گھر گھر اور گلی کوچوں میں خاص لَے اور دھن میں انہیں پڑھنا اور اپنی زبان میں ان کا ترجمہ و مطلب بیان کرنا اور اس طرح کمانا کھانا شروع کر دیا۔ اس طرح ان نظموں کے الفاظ و فقرات زبان زد ہو کر دلوں میں گھر کرتے اور اس راہ سے دماغی نشو و نما میں خاص حصہ لیتے اور اس ملک کا کیرکٹر بناتے رہے۔

مہابھارت زیادہ تر مذہبی رنگ لئے ہوئے، آپس کی جنگ کا کارنامہ تھی۔ اور راماین، زیادہ تر، قصّوں، لطیفوں، اور چٹکلوں کا گلدستہ بلکہ گلستاں و بوستاں اور پھر غیروں سے لڑائی اور ان پر فتح کا دوسرا شاہنامہ تھی! اس وجہ سے وہ زیادہ مقبول ہوئی اور یہاں کی غیر آریا

---

[1] یہاں وہ بھاٹ، بگڑ کر، بھانڈ بنے اور وہاں انگریزی میں بارڈ (Bard.) ہو گئے!

یعنی اصلی ملکی زبانوں میں اس کے الفاظ بھی پھٹنے لگے۔ سنسکرت یہاں کی زبانوں پر ثقیل تھی۔ ان دونوں نظموں کے عام ہونے سے ان کے الفاظ یہاں کے لب و لہجہ کے موافق بننا اور زبان پر چڑھنا شروع ہو گئے اور اس سے (بہ ظاہر) ایک نئی قسم کی زبان پھیلنے لگی جسے عرف عام میں سنکرتی بھاشا یا بھابھاشا کا لقب پڑا جو ممتاز غیر آریوں کی زبان سمجھی گئی اور جسے آریا، بلکہ برہمن تک بولے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

راماین یہاں کی خاص زبانوں میں بھی ترجمہ ہوئی۔ ہندو دھرم اور سنسکرت کے مٹنے پر جین[1] مت نے ان دونوں نظموں کو بہت سنبھالا اور

---

[1] جین مت اور بودھ مت کے بانی گو دو ہیں مگر دونوں متوں کی روایت و حکایت ایک ہے۔ بودھ مت شمال ہند میں پھیلا اور جین مت وسط ہند و دکن میں رائج ہوا۔ بودھ مذہب یہاں سے مٹ گیا مگر جین مت زندہ اور ہمارے مارواڑیوں کی بدولت اب تک دھنی ہے! مالوا (اجین) شروع میں اس مت کا مرکز رہا۔ ادھر کے راجہ قوماً، عموماً تاتاری (غیر آریا) تھے۔ مشہور بکرما جیت اور راجہ بھوج اس مت کے پیرو تھے جن کے علمی ذوق و شوق اور فیاضیوں کی بدولت مالوا ایک زمانہ میں دارالفنون اور بھاشا کا دلی و لکھنو بنا رہا!!

دکن و اطراف دکن اور خصوصاً درویدی زبانوں (مثل کناری[1] وغیرہ) میں ان کا ترجمہ ہی نہیں ہوا بلکہ یہ دونوں قصے مستقل طور پر وہاں بھی لکھے گئے اور اُدھر کے لٹریچر (ادب) کا سرمایہ ہو گئے۔

ادی پمپا، اس عہد (جینی زمانہ) کا ایک ممتاز شاعر ہے اس نے پمپا بھرت (مہابھارت کا جواب) لکھ کر چندر بنسیوں کا نام اُدھر بھی روشن کر دیا۔ اور پھر وہاں والمیکی کے جواب میں ایک دوسرا نامی شاعر ابھی پمپا (دوم) کھڑا ہوا جس نے اپنی پمپا راماٗن سے، سورج بنسیوں[2] کو اُدھر بھی چمکا دیا

---

[1] کناری غیر آریا۔ اور درویدی زبانوں کی ایک شاخ (مثل تامل، تلنگی اور ملائی) اتنے انقلابوں کے بعد بھی اب تک یہ بھاکھا زندہ اور ریاست میسور کے ایک خاص حصہ میں رائج ہے۔ یہ ریاست اس وقت اس کی ترقی میں کوشاں اور اسے زبان (Language) کے درجہ تک لانے کی کوشش کر رہی ہے

[2] یہ دونوں شعرا اپنی اپنی نظموں میں قدیم مہابھارت اور والمیکی کی راماٗن کے مضامین سے اکثر اختلاف کرتے ہیں۔ پمپا اپنی راماٗن میں دکھن کے راکسوں (راکشش) کو برخلاف والمیکی کے ایک خاص عنصر کا مخلوق بتاتا ہے اس کے نزدیک کھچارا اور بھچارا (جن و انس!) دو طرح کی خلقت اس زمین پر ہے ایک زمین پر چلتی پھرتی دکھائی دیتی (انس) اور دوسری ہوا پر اڑتی (جن) اور نظروں سے غائب رہتی ہے! پمپا کے خیال میں ہنومان، لنکا پر پل باندھکر نہیں اترے بلکہ یہ کھچارا تھے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۹ پر دیکھئے)

سنسکرت کا چراغ جب ادھر (شمال میں) ٹمٹمانے لگا اور اس وجہ سے یہ قصے بھی سرد ہونے لگے تو آخر بابا تلسی داس[1] نے انہیں اپنی بھاشا میں لا کر پھر گرم کر دیا۔ اس سے اصل چیز مٹنے ہی سے نہ بچ گئی بلکہ اب وہ یہاں کی چہیتی زبان میں آ کر اور زیادہ محبوب و مقبول ہو گئی۔ اور اسکی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۸)

جو فوج کو ہوا پر اڑا کر اس طرف لے گئے! پمپا ہنومان کو (برخلاف والمیکی کے) سچ مچ کا بندر نہیں مانتا۔ بلکہ کہتا ہے کہ انکی فوج کے نشان پر بندر کا مارکہ تھا اور اس سے وہ قوم اس طرح سمجھ لی گئی! وہ (پمپا) راون کے دس سروں کا بھی قایل نہیں۔ کہتا ہے کہ جس کمرے میں وہ (راون) پیدا ہوا اس میں آینے (آئینے) جڑے تھے۔ اس کے عکس سے ایک سر کے دس سر نظر آتے تھے۔ اس حجت سے راون دس سروالا مشہور ہو گیا!! (کناری لٹریچر۔ از پرائس)

[1] ۔ بابا تلسی داس ان کا زمانہ مغلوں کا شروع عہد ہے۔ جب سنسکرت تو کب کی رخصت ہو چکی، بھاشا بھی اپنی پچھلی آتار کر خول بدل چکی اور اردو بننے کے لئے تیار ہو رہی تھی! تلسی داس نے رامائن کا خلاصہ کیا اور اس زبان میں اپنی رام کہانی سنائی جو اس وقت کے ہندو عوام کی بھاکھا تھی اسکے علاوہ ملک میں اس زبان کا درجہ بلند ہو چکا اور وہی بھاشا جس طرح سنسکرت کے اثر سے سنسکرتی بھاشا یا مہا بھاشا بنی تھی اسی طرح اب وہ عربی و فارسی کے اثر سے فارسی بھاشا کہے جانے کی مستحق تھی (بقیہ حاشیہ ۱۵۰ پر دیکھئے)

کتھا دماغوں میں جگہ پکڑنے اور اپنی روشنی پھیلانے لگی ! اس طرح یہ دونوں نادر افسانے کئی ہزار سال کی گردش کے بعد بھی تباہی سے بچے اور انقلاب کے پنجے سے محفوظ چلے آتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۹)

اور اب جیسے زود فہم، ہندو مسلمان دونوں بول رہے تھے ! بابا تلسی داس نے معمولی لوگوں اور عوام کے لئے اپنی رامائن لکھی اور بھر والمیکی کی تقلید بھی فرض اور اس کی شاعری وتخیل کی پیروی بھی واجب تھی اس وجہ سے وہ ٹھیٹھ ہندی کے بولنے پر مجبور تھے۔ اُس پر انکی رامائن عربی اور خصوصاً رائج فارسی لفظوں کا ایک فرہنگ بن گئی ! باباجی نے اکبر کا زمانہ بھی دیکھا اور نورتنی مجلس میں کئی بار انہیں جگہ بھی دیگئی اور ان کی رامائن کی قدر کی گئی !!

Extract from the Rules:—

Books are issued for fourteen days only.

A fine of half anna per day will be charged for each volume kept over time.

Books lost, defaced or injured in any way shall have to be replaced by the Borrowers.